ہماری ویب ڈیجیٹل بک

حُر ثقلین

HUR SAQLAIN

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Hur Saqlain"
at Hamariweb.com

وکالت ایک مشن یا پیشہ

کسی بھی معاشرے کی ترقی اور خوشحالی میں انصاف کو بنیادی حیثیت حاصل ہے انصاف کے بغیر معاشرہ کبھی پر امن نہیں رہ سکتا ہے ملک کے اندر نظام حکومت کوئی بھی ہو اگر انصاف نہیں ہوگا تو وہ نظام بدترین ہو گا یہی وجہ ہے کہ اگر جمہوریت جیسے مقبول ترین نظام حکومت میں بھی انصاف نہ ہو تو وہ آمریت سے بھی بدتر ہو گا گویا جس معاشرے میں انصاف ہو گا وہی معاشرہ مثالی ہو گا چہ جائیکہ وہاں طرز حکومت کوئی بھی ہو۔آج دنیا بھر میں سستے اور تیز تر انصاف کی فراہمی پر زور دیا جاتا ہے ترقی یافتہ ممالک اسی وجہ سے ترقی یافتہ ہیں کہ وہاں انصاف کا حصول انتہائی آسان ہے اور عام آدمی کو بھی انصاف میسر ہے تیسری دنیا کے ممالک کی پسماندگی کی وجہ انصاف کی عدم فراہمی ہے جن معاشروں میں انصاف نہیں ہوتا وہاں ہمیشہ ظلم پروان چڑھتا ہے اور وہ معاشرے بدامنی کا شکار ہوتے ہیں انسان نے انصاف کے حصول کے لیے مختلف طریقے اپنائے انسانی معاشروں میں عدالتوں کے نظام کو متعارف کروایا گیاقدیم تاریخ میں عام آدمی انصاف کے حصول کے لیے حکمرانوں کے دروازوں پر دستک دیا کرتے تھے یا ان کے مقرر کردہ ججوں سے انصاف کی بھیگ مانگا کرتے تھے اس عمل میں عام آدمی کو کافی مشکلات پیش آتی تھی وہ اپنا نقطہ نظر پیش کرنے سے ہچکچاتے تھے اسی وجہ سے انگلستان

میں طبقہ امراء میں سے چند افراد نے ان عام آدمیوں کی مدد کا فیصلہ کیا وہ لوگوں کے مسائل کو بادشاہ تک پہنچاتے اور ان کے لیے مرعات اور سہولتیں حاصل کرتے یوں آہستہ آہستہ لوگوں کا انصاف ملنا شروع ہو گیا اور وکالت کا شعبہ متعارف ہونے لگا انگریز جب برصغیر میں آیا تو اس نے عوام اور حکمرانوں میں فاصلہ کم کرنے کے لیے وکالت کا شعبہ متعارف کروایا یہاں بھی ابتداء میں امراء کا طبقہ اس شعبے سے منسلک تھا ان وکلاء کا کام عام آدمی کی آواز کو حکام بالا تک پہنچانا اور انہیں انصاف دلانا تھا یہ سارا کام بغیر کسی معاوضے اور لالچ کے سرانجام دیا جاتا تھا اور صرف خدمت کے جذبے سرشار ہو کر ہی وکلاء لوگوں کے کام آیا کرتے تھے یہ انتہائی معزز کام تھا جس کی کوئی قیمت ادا نہیں کر سکتا تھا البتہ اگر کوئی اپنی خوشی سے کچھ دینا چاہے تو وہ وکیل کے پہنے ہوئے گاؤن کی پشت پر لگی جیب میں ڈال سکتا تھا وکیل کو اس سے کوئی غرض نہ ہوتی کہ اسے کیا دیا جا رہا ہے اسی دوران برصغیر کے مسلمانوں کو قائد اعظم جیسا عظیم وکیل ملا جس نے ان کے الگ ملک کے حصول کے لیے مفت مقدمہ لڑا آپ انتہائی نیک، دیانت دار اور شریف انسان تھے قیام پاکستان کے بعد بھی اچھے لوگ اس شعبے سے منسلک رہے اور وکالت کو عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا دنیا بھر میں ڈاکٹرز سمیت تمام شعبوں سے زیادہ باعزت اور باوقار شعبہ وکالت کا ہی ہے یہی مقام اسے پاکستان میں بھی حاصل رہا ہے پاکستان میں وکالت اور بار کونسلوں کے لیے پہلی بار legal practioners and

انیس سو چوہتر میں متعارف کروایا گیا اس ایکٹ کے تحت کوئی bar councils act
بھی وکیل فیس طے نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی پیسوں کی وجہ سے مقدمہ لینے سے انکار کر
سکتا ہے اس ایکٹ کے مطابق وکیل کے جو اوصاف بیان کیے گے ہیں اگر انہیں مذہبی انداز
میں دیکھا جائے تو وہ کسی متقی کے ہی اوصاف ہو سکتے ہیں یعنی وکیل کے لیے انتہائی اعلیٰ
کردار کا ہونا ضروری ہے بار کونسلیں بھی اعلیٰ روایات اور اچھے کردار کی حامل رہی
ہیں ان میں سے ایک روایت یہ بھی تھی کی بار کونسل کا صدر کبھی ہائی کورٹ کا جج نہیں
بنتا تھا مگر اب صورت حال یکسر بدل چکی ہے اب تو صدر بنا ہی اسی لیے جاتا ہے کہ جج
بنا جاسکے وکیل بار کونسلوں کے عہدے حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتے ہیں
صرف لاہور بار کے سیکرٹری کے الیکشن کا خرچہ نصف کروڑ سے زائد ہے اب اگر کوئی
شخص وکیل کے خلاف بار میں درخواست لے کر جائے تو اسے دھکے مار کر وہاں سے
نکال دیا جاتا ہے کیونکہ انہیں اپنے ووٹ عزیز ہوتے ہیں نہ کہ انصاف۔ وکیل کے ذاتی
مقدمے میں دوسری طرف سے کوئی وکیل نہیں پیش ہوتا ہے عام آدمی آج انصاف
دلانے والوں کے ہاتھوں ہی ذلیل و خوار ہو رہا ہے موجودہ دور میں وکلاء کا طرز عمل
اس شعبے کی روایات اور اعلیٰ اقدار کے بالکل منافی ہے اور وہ گھٹیا پن کا مظاہرہ کر رہے
ہے کبھی پولیس والوں کو تھپڑ مارے جا رہے ہیں کبھی ججوں کو جوتوں کی سلامی دی جا
رہی ہے کبھی عدالتی عملے کے بال نوچے جا رہے ہیں اور کبھی سرکاری اہلکاروں کے کپڑے
پھاڑے جا رہے ہیں مرضی کے فیصلے نہ

ہونے پر ججوں کو کمروں میں قید کر دیا جاتا ہے جج انہی وکلاء کے خلاف آئے روز سراپا احتجاج ہوتے ہیں سڑکوں بازاروں اور ہوٹلوں میں لوگ ان کی درندگی اور دہشت سے ڈرنے لگے ہیں آج پاکستان میں تمام شعبے تنزلی اور انحطاط کا شکار ہیں رشوت ہر جگہ عام ہے مگر وکالت کی اعلیٰ روایات اس بات کی ہر گز اجازت نہیں دیتیں کہ یہ لوگ بھی اس گندے نظام کا حصہ بنیں انہوں نے تو قوم کو برے نظام سے اچھے نظام کی طرف لے کے جانا ہے جس طرح قائد اعظم نے غلامی سے آزادی کی طرف سفر طے کیا مگر افسوس آج قائد کی تصویر ہر بار کونسل اور وکیل کے دفتر میں لگی ہوئی ہے مگر ان کی روایات دیانت داری اور سب سے بڑھ کر شرافت کہیں بھی نظر نہیں آتی وکلاء کے آئے روز کے جھگڑے رشوت اور بدعنوانی کے پیسے کی غیر مساویانہ تقسیم کی وجہ سے ہو رہے ہیں یہ لوگ اپنا اپنا حصہ بڑھانے کے معاملے پر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتے ہیں عدالتی کمیشن میں نام درج کروانے کے لیے بھی پیسے دیے جاتے ہیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ڈیلر اور وکیل میں کوئی فرق نہیں رہا۔ کیا یہ سب وکیل کی شان کے مطابق ہے مختصر یہ کہ آج کے معاشرے میں وکیل اپنا مقام اور عزت کھو چکا ہے اگرچہ کہ وکلاء اپنے دفاع میں یہ ضرور کہتے ہیں کہ اس شعبے میں چند لوگوں کہ وجہ سے انہیں ندامت اور شرمندگی کا سامنا ہے درست مگر حالات کو درست کرنا بھی ان کی ذمہ داری ہے کیوں ایسے وکلاء کے لائسنس منسوخ نہیں کیے جاتے محض ووٹ کے حصول کے لیے اتنی شرمندگی مول لی جاتی ہے آج عام آدمی یہ سوال کرنے

پر مجبور ہے کہ وکیل اب مہذب اور شائستہ کیوں نہیں رہے کیا اب ان کا تعلق معزز اور شریف خاندانوں سے نہیں ہے کیا ان کی تعلیم وتربیت میں کوئی فرق رہ گیا ہے انہی وکیلوں نے آگے چل کر جج بننا ہے یہ کیا انصاف کریں گے ؟ان سوالوں کا جواب تو وکلاء کو ہی دینا ہے مگر یہ بات درست ہے کہ وکالت کا شعبہ پیسہ کمانے کے لیے ہر گز نہیں تھا بلکہ ایک مشن کے طور پر لوگ اس طرف آتے تھے ان کا مقصد نیک اور نیت صاف ہوتی تھی مگر جب سے وکالت کو پیشہ سمجھا جانے لگا ہے اور اسے دولت کمانے کا ذریعہ گردانا جانے لگا ہے تب سے اس میں بیگاڑ پیدا ہوا ہے اور خرابیاں اور کوتاہیاں پیدا ہونا شروع ہوئی ہیں اگر اسے مشن ہی رہنے دیا جاتا تو وکلاء کی آج یوں رسوائی نہ ہوتی جب سے وکالت کو پیشہ بنایا گیا ان کی پہلے جیسی عزت نہیں رہی قائداعظم جیسے لوگوں نے وکالت کو مشن کے طور پر اختیار کیا تھا ایسے وکلاء کا مقام اور رتبہ اب بھی بلند ہے ۔

ایران اور 5 + 1 کے درمیان کامیاب مذاکرات

ایران اپنے ایٹمی پروگرام کی وجہ سے گزشتہ ایک دہائی سے شدید عالمی پابندیوں کا شکار رہا ہے۔ 1979 کے اسلامی انقلاب کے بعد سے وہ مسلسل حالت جنگ میں رہا ہے عالمی طاقتوں کا یہ خیال رہا ہے کہ ایران اپنے اس انقلاب کو باقی ملکوں تک بھی پھیلائے گا اور اس کے ارادے وسعت کے ہیں خطے میں موجود عرب ملکوں کو بھی خدشہ رہا کہ یہ انقلاب ان کی ملوکیت کے لیے بھی تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے اسی خیال کے پیش نظر اسے عراق کے ساتھ ایک طویل جنگ میں الجھائے رکھا گیا اور عالمی طاقتوں اور عرب ملکوں نے ایران پر کڑی نظر رکھی اسرائیل کے ذریعے بھی اس پر دباؤ قائم کیا گیا یہی وجہ ہے کہ ایران نے اپنے دفاع اور تحفظ کے لیے ایٹمی پراگرام شروع کیا ایران کا خیال تھا کہ وہ ایٹمی قوت حاصل کرکے عالمی طاقتوں کے ساتھ معاملات بہتر انداز میں طے کر سکتا ہے ہے ادھر امریکہ اور یورپ بھی یہ بات بخوبی سمجھتے رہے ہیں کہ ایران کے ایٹمی طاقت بننے سے دنیا میں طاقت کا توازن بھی بگڑ جائے گا اسی لیے یہ طاقتیں ایران کے ایٹمی پروگرام کے خلاف ہیں ایران کو بھی اپنا ایٹمی پروگرام جاری رکھنے کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہے اور اسے شدید عالمی اقتصادی پابندیوں کا سامنا رہا ہے ایران کی کوشش رہی ہے کہ وہ کسی طرح ان پابندیوں سے چھٹکارا حاصل کرلے مگر وہ ان میں

کامیاب نہ ہو سکا در حقیقت ایران میں حکومت کے ساتھ ایک متوازی نظام وہاں کے اسلامی انقلاب کے سپریم لیڈر خامنائی کی قیادت میں بھی موجود ہے ایران میں کوئی بھی حکومت ان کی مرضی اور منشا کے بغیر نہ پالیسی بنا سکتی ہے اور نہ ہی کوئی اہم اور بڑا فیصلہ کر سکتی ہے ایران کے حالیہ انتخابات میں کامیاب ہونے والے صدر حسن روحانی نے روز اوّل سے ہی یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ اس مسلے کا حل جلد سے جلد نکال لیں گے ایرانی عوام نے ووٹ بھی انہیں اسی مقصد کے لیے دیے تھے جبکہ دوسری طرف ایران کے روحانی پیشوا اپنے موقف پر قائم رہے ہیں نومبر کو حالیہ مذاکرات کے شروع ہونے سے چھ گھنٹے قبل بھی انہوں نے مذاکرات کاروں کو خبردار کیا تھا کہ ایران جوہری توانائی کے حق سے کسی بھی صورت دستبردار نہیں ہو گا مگر ایران کی سیاسی حکومت نے بڑے تدبر اور سمجھداری کے ساتھ اس سارے معاملے کو نبھایا ہے اور روس کی مدد سے سلامتی کونسل کے پانچ مستقل ارکان کے ساتھ مذاکرات کو ابتدائی طور پر کامیاب بنایا ہے یہ اس خطے کے امن کے لیے ایک بڑی کامیابی کی طرف پہلا قدم ہے اس معاہدے کے مطابق اب ایران بیس فیصد یورینیم افزودہ کرنے کے اپنے حق سے دستبردار ہوا ہے تاہم وہ معمولی نوعیت کی افزودگی جاری رکھ سکے گا اس کے عوض ایران کو ابتدائی طور پر سات ارب ڈالر کی امداد بھی ملے گی اور یورپ اور امریکہ میں اس کے اربوں ڈالر کے منجمند اثاثے بحال ہو جائیں گے مزید اس پر لاگو اقتصادی عالمی پابندیاں بتدریج کم ہو جائیں گی۔ یہ معاہدہ ایرانی

عوام کے لیے کافی سود مند ثابت ہو گا اور ان کی معاشی تکالیف کو کم کرے گا مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ معاہدہ خطے میں امن کی بھی ضمانت ہو گا حالیہ دس برسوں سے اس خطے میں جنگ کے جو بادل منڈلا رہے تھے وہ بلا شبہ اب چھٹ جائیں گے اس معاہدے کو کامیاب بنانے میں نئے ایرانی صدر کی کوششیں قابل تعریف ہیں مگر اس کے سات ساتھ روس کے سفارتی کردار کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے وسطی ریاستوں کے آزاد ہونے سے دنیا میں جو طاقت کا توازن بگڑا تھا روس اسے اب کامیاب سفارت کاری کے ذریعے دوبارہ متوازی بنا رہا ہے عالمی سیاست میں امریکہ کی تنہا اجارہ داری کو روس بڑے نپے تلے انداز میں کم کرتا ہوا نظر آ رہا ہے گزشتہ چند ماہ قبل جب امریکہ شام پر فوجی حملہ کرنے کے لیے تیار تھا تو اس وقت بھی روس نے کمال مہارت اور عمدہ سفارت کاری کے ذریعے اسے حربی اقدام سے باز رکھا تھا جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں تیزی سے بڑھتے ہوے امریکی اثر کو کم کرنے کی اشد ضرورت ہے اور روس کو ابھی اور کوششیں اور کام کرنا ہے ہمارا ملک پاکستان بھی امریکی اقدامات کا شکار ہے اور اس کی فہرست کافی طویل ہے آج ہمیں بھی ایران سے کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے یہاں بھی مذہبی قوت و مقتدرہ اور سیاسی حکومت کی شکل میں دو متوازی نظام موجود ہیں ادھر بھی نواز شریف کو حسن روحانی سے کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے امریکہ سے روس کی طرف منتقل ہونے میں ہماری مشکلات کم ہو سکتی ہیں اگر پاکستان عالمی سفارت کاری کے محاذ پر روس کی مدد حاصل کر لے تو پھر یہاں

بھی ڈرون حملے بند ہو سکتے ہیں اور نیٹو سپلائی کے معاملات دھرنوں کی بجائے مذاکرات
۔ کے میز پر بخوبی طے ہو سکتے ہیں بات صرف سمجھنے کی اور رخ بدلنے کی ہے

نئی قیادت کی ضرورت

کسی بھی قوم کو ترقی اور خوشحالی کی منزل تک لے جانے میں اس قوم کی قیادت کا اہم کردار ہوتا ہے۔اگر رہبر مخلص ،دیانتدار،ذہین،دوراندیش،بہادر اور وفادار ہو گا تو وہ قوم کو تمام تر مشکلات کو عبور کراکے اپنی منزل تک لے جائے گا قوم کے اندر پائی جانے والی کچھ کمزوریوں کو رہبر اپنی صلاحیتوں سے پورا کرتے ہیں۔کسی بھی قوم کے رہنماء کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی قوم کے مفادات کے لیے اپنی ذاتی پسند و ناپسند اور مفادات کو بالائے طاق میں رکھتے ہوئے فیصلے کرے بصورت دیگر وہ قوم راہوں میں ہی بھٹکتی رہے گی بد قسمتی سے پاکستانی قوم کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے جو ابھی تک اپنی منزل سے کوسوں دور ہے اس قوم کی صلاحیتوں پر کسی کو شک نہیں اس کے افراد باصلاحیت،ذہین،دیانتدار،بہادر اور وفادار ہیں ان کی قابلیت اور صلاحیت کا اعتراف دنیا بھر میں کیا جاتا ہے یہ زندگی کے ہر شعبے میں اپنی مثال آپ ہیں اگر انہیں مواقع میسر ہوں تو یہ ناممکن کو ممکن بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔اگر قیام پاکستان سے لیکر اب تک اس قوم کو مناسب ماحول اور اچھے مواقع فراہم کیے جاتے تو بلا شبہ یہ قوم آج باقی اقوام کے لیے باعث تقلید ہوتی اور اس کو عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج دنیا بھر میں پاکستانیوں کی جو

رسوائی ہے وہ انتہائی قابل رحم ہے کچھ غیروں کی سازش اور کچھ اپنوں کی غداری نے اس قوم کو منتشر کرکے رکھ دیا ہے قیام پاکستان سے لے کر آج تک نہ تو یہاں کسی بھی نظام حکوت کا تسلسل رہا اور نہ ہی کوئی اچھی قیادت پنپ سکی اگر کوئی مخلص لیڈر میسر آیا اور قوم نے اس پر اعتماد بھی کیا تو اسے منظر سے ہٹا دیا گیا یہ پاکستانیوں کی بد قسمتی رہی ہے کہ وہ اچھی قیادت سے محروم رہی ہے یہاں پائی جانے والی قیادت کا یہ المیہ رہا ہے کہ وہ ہمیشہ بیرونی طاقتوں کے زیر اثر رہی ہے انہوں نے اکثر مواقع پر ملکی اور قومی مفادات کی بجائے غیر ملکی قوتوں کے مفادات کا خیال رکھا پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے روس کو نظر انداز کرکے اپنے پہلے دورہ امریکہ سے لے کر آج پاکستان میں موجود دہشت گردوں کے خلاف آپریشن کرنے کے فیصلوں تک تمام امور میں غیر ملکی ہدایات کا عمل دخل رہا ہے اب یہاں تمام چھوٹے بڑے فیصلے غیر ملکی قوتوں کی مرضی اور منشا کو مد نظر رکھ کر کیے جانے لگے ہیں گزشتہ صدی کے وسط میں نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد ایک نئی طرز کے نظام حکمرانی نے جنم لیا اور تیسری دنیا کے ملکوں کو بھی اسی نئے نظام کے تحت نام نہاد آزادیاں دی گئی تاہم بنیادی طور پر طرز حکومت وہی رہا اور فیصلہ سازی کی قوت عالمی طاقتوں نے اپنے پاس ہی رکھی اور ان آزاد کردہ ملکوں اور قوموں کی دل لگی کے لیے کچھ اختیارات ان کو بھی تفویض کیے گئے پاکستان بھی نو آبادیاتی نظام کا حصہ رہا ہے اور آج یہ بھی نئے عالمی نظام حکمرانی کے تحت

عالمی قوتوں کے زیر اثر ہے بد قسمتی سے پاکستانیوں کو قائدِاعظم کے بعد کوئی ایسا رہنماء میسر نہیں آیا جو وسیع النظر ہو اور جس کی عالمی نظام اور حالات پر گہری نظر ہو اور جو پاکستانیوں کو اس جدید نظام حکمرانی سے ایک بار پھر آزادی دلاسکے یورپ اور امریکہ دنیا بھر کے وسائل سمیٹنا چاہتے ہیں اور وہ اب تک اپنے ان عزائم میں کامیاب بھی ہیں امریکہ تنہا دنیا کا طاقت ور حکمران بن کر سامنے آیا ہے دوسری عالمی جنگ کے بعد سے ایشیا کے وسائل کو یورپ اور امریکہ نے خوب لوٹا ہے اس نے یہاں اس خطے کے مسلمانوں کو ساتھ ملا کر روس کو تباہ کیا اور پھر تن تنہا وسائل کو اپنی طرف منتقل کیا آج روس ایک بار پھر اپنی طاقت کو جمع کر کے یورپ اور امریکہ کی اس یلغار کے سامنے بند باندھنے کے لیے تیار ہو رہا ہے اور وہ امریکہ کے توسیع پسندانہ عزائم کے سامنے کھڑا ہونے جا رہا ہے خطے کے تیزی سے بدلتے حالات تیسری عالمی جنگ کا اشارہ دے رہے ہیں اس جنگ کا میدان ملکِ شام میں سجنے جا رہا ہے ایران، سعودی عرب، لبنان، تیونس مصر، کویت، یمن اور بحرین تک کا علاقہ اس کی لپیٹ میں آسکتا ہے اور پاکستان بھی اس، کی حرارت سے محفوظ نہیں رہ سکتا ہے کیونکہ پاکستانیوں میں پائی جانے والی صلاحتیں اپنی مثال آپ ہیں ان کی بہادری اور دلیری تاریخی طور پر تسلیم شدہ ہے یہی وجہ ہے کہ کوئی ملک اپنے لیے یہاں کی فوج مانگ رہا ہے اور کوئی یہاں کی افرادی قوت کو اپنے ہاں پولیس فورس میں بھرتی کرنا چاہتا ہے یہاں پائے جانے والے جنگجو گروپوں کی

مانگ میں بھی اضافہ ہوا ہے ان کو بھی شام ، یمن اور بحرین وغیرہ میں بلایا جا رہا ہے آگ اور خون کے اس نئے کھیل میں پاکستان کا کردار افغان جنگ کی طرح بڑا بنیادی نوعیت کا ہو گا۔آج پاکستانیوں کو سوچنا ہو گا کہ انہیں آگ کا ایندھن بننا ہے یا اپنے آپ کو اس سے بچانا ہے بد قسمتی سے آج یہاں کوئی ایسا رہبر نہیں جو اس قوم کو امن اور خوشحالی کی منزل کی طرف لے کر جائے انتخابات کے نتیجے میں بھی سرمایہ دار طبقہ ہی ان پر مسلط کیا گیا جن کا مقصد اپنے سرمائے میں اضافے کے سوا اور کچھ نہیں ہے لوگوں کی نظر ایک بار پھر کسی رہبر کی بجائے کسی ادارے کی طرف مرکوز ہوتی نظر آ رہی ہے یہ ایک فریب نگاہ ہے پاکستانی قوم سیاسی و عسکری قیادت کے درمیان شٹل کاک بن کر رہ گئی ہے انہیں اپنے لیے از سر نو سوچنا ہو گا اپنے لیے منزل اور راستے کا تعین پھر سے کرنا ہو گا غلامی کے چنگل سے نکلنے کے لیے پھر سے کوشش کرنا ہو گی یہاں کے شاعروں،ادیبوں، تجزیہ نگاروں ،کالم نویسوں ،دانشوروں،اساتذہ اور مخلص سیاستدانوں سمیت ذرائع ابلاغ سے وابستہ افراد کی یہ بھاری ذمہ داری ہے کہ وہ قوم کی رہنمائی کریں اور نئے شروع ہونے والے آگ و خون کے کھیل سے اس قوم کو بچانے کی تدبیر کریں یہ پاکستانی قوم کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو باخبر رکھیں اور کسی بھی رہبر کی آواز پر بغیر سوچے سمجھے لبیک نہ کہیں اور کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے یا کسی کی بھی حمایت یا مخالفت میں نکلنے سے قبل اچھی طرح سوچ بچار کر لیں اب کی بار جذباتی فیصلے ان کے لیے اور ان

کی نسلوں کے لیے ہمیشہ کے لیے تباہی کا سبب بن سکتے ہیں اگر قوم اپنا طرز عمل اور سوچ بدلے گی اور سرمایہ دار، جنونی، جذباتی اور غیر ملکی آقاؤں کی خوشنودی کے لیے کام کرنے والے رہبروں پر عدام اعتماد کرے گی تو اسے وفادار، بہادر اور مخلص قیادت ضرور دستیاب ہو گی۔

ایرانی سمجھوتے کے پاکستان اور خطے پر اثرات

عالمی سیاست میں سال 2013 کے اہم واقعات میں ایران کا 5+1 کے ساتھ سمجھوتہ ایک اہم واقعہ ہے اس سمجھوتے نے عالمی سیاست کے رخ کو بدل کے رکھ دیا ہے مستقبل قریب میں اس کے اثرات دنیا کے سامنے کھل کر سامنے آئیں گے مگر اس سارے تناظر میں پاکستان اور بالخصوص اس خطے پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوں گے یہ حسن اتفاق تھا یا پاکستان کا اضطراب کہ اس سمجھوتے پر ہونے والے دستخطوں کی سیاہی ابھی خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ سب سے پہلے اس کے مشیر خارجہ نے ایران کے ساتھ رابطہ کیا اور پاکستانی وزراء نے ایران پاک گیس پائپ لائن منصوبے پر تبصرے شروع کر دیے پاکستانی حکمرانوں نے اپنی قوم کو یہ تاثر دینا شروع کر دیا ہے کہ اب یہ منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچ جائے گا وہ اس تاثر کو بھی زائل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مسلم لیگ ن کی حکومت نے اپنے قیام کے فوری ساتھ ہی سعودی عرب کی ایماء پر اس منصوبے کو سرد خانے میں نہیں ڈالا تھا بلکہ یہی عالمی پابندیاں تھیں جو اس کی راہ میں روکاوٹ تھیں مگر صورت حال مختلف ہے ایران پاک گیس پائپ لائن منصوبے سے متعلق دونوں ملکوں کے درمیان بات چیت 2007 میں شروع ہوئی تھی اور قریب 2008 میں یہ معاہدہ طے پا گیا تھا اس کے مطابق ایران نے اپنی پارس گیس فیلڈ سے قدرتی گیس پاکستان کو

دینی تھی دونوں ملکوں نے اپنے اپنے علاقوں میں پائپ لائن بچھانی تھی قیمتوں کا تعین بھی ایک فارمولے کے تحت کیا جا چکا تھا یہ منصوبہ دسمبر 2012 میں تکمیل ہونا تھا اور گیس کی ترسیل جنوری 2103 سے شروع ہو جانی تھی یہ معاہدہ take or pay کی بنیاد پر تھا یعنی پاکستان اگر گیس نہیں بھی لیتا تو اس کو گیس کی طے شدہ قیمت ہر صورت ادا کرنا ہو گی۔ایران نے اپنے اوپر عالمی اقتصادی پابندیوں کے ہوتے ہوئے بھی اپنے علاقے میں مقررہ وقت کے اندر پائپ لائن بچھا لی ہے جبکہ پاکستان نے اپنے علاقے میں 782 کلو میٹر پائپ لائن تا حال نہیں بچھائی ہے پاکستان کی اس سستی اور نااہلی کو چھپانے کے لیے وزیر اعظم نواز شریف نے گیس کی قیمت کا از سر نو تعین کرنے کا ایران سے مطالبہ کیا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ پاکستان آئندہ کئی برس تک بھی 46 انچ قطر کی اتنی طویل پائپ لائن نہیں بچھا سکتا ہے اس معاہدے کے مطابق تنازع پیدا ہونے کی صورت میں مصالحت کے لیے فرانس اور اس ہی ملک کے قوانین کے مطابق معاملات طے ہوں گے اب ایران کو گیس بیچنے کی ضرورت بھی نہیں رہی ہے اگر وہ یہ معاملہ مصالحتی کونسل میں لے جاتا ہے اور فرانس بھی اس کے لیے اب نرم گوشہ رکھتا ہے تو پاکستان کے لیے کافی مشکلات ہوں گی اور اسے بھاری بھر کم جرمانہ ادا کرنا ہو گا دوسری طرف پاکستان کے بہت سے معاملات افغانستان اور طالبان کے ساتھ جڑے ہوے ہیں اور اس خطے کی تمام تر صورت حال کا دارومدار نہیں تعلقات پر ہے ایرانی سمجھوتے کے بعد ان تعلقات اور معاملات پر بھی گہرے اثرات مرتب

ہوں گے امریکہ کی اب اس خطے میں ترجیحات مختلف ہو جائیں گی۔ایران،افغانستان میں موجود شمالی اتحاد،انڈیا اور امریکہ پر مشتمل ایک نیا بلاک تشکیل پاتا نظر آ رہا ہے یہ بلاک طالبان کے خلاف ایک منفرد انداز میں کاروائی کرے گا جس کے پاکستان کے اندر مذہبی اور فرقہ وارانہ اثرات مرتب ہوں گے افغان صدر 2014کے بعد سے وہاں امریکی فوج کی موجودگی کے معاہدے پر دستخط نہیں کر رہے ہیں ادھر عمران خان اپنی مرضی یا امریکہ کی خواہش پر نیٹو سپلائی روکنے کو ڈرامہ رچا رہے ہیں یہ دونوں امریکہ اور ایران کو ایک دوسرے کے اور قریب کر دیں گے بھارت کو بھی حافظ سعید کے ساتھ ساتھ کئی ایک پاکستانی مطلوب ہیں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ 2014کے بعد سے امریکہ کا اس خطے میں رہنے کا کیا جواز ہے تو ان کے لیے عرض ہے کہ امریکہ وہ جواز بڑی عیاری کے ساتھ پیدا کر رہا ہے اور عمران خان جیسے لوگ طالبان کی حمایت کر کے وہ جواز پیدا کرنے میں امریکہ کی مدد کر رہے ہیں اب اگر مریکہ ایران کی مدد سے شمالی اتحاد کو طالبان کے خلاف مالی اور عسکری مدد فراہم کرتا ہے تو اس خطے اور پاکستان میں ہونے والی خون ریزی کا اندزہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے ایران اور امریکہ کا ایک میز پر بیٹھنا کسی مشترکہ مفاد ہی کی وجہ سے ہی ہے یوکرائن اور جاپان کے ذریعے امریکہ روس اور چین پر دباؤ بڑھا رہا ہے ایسے میں خطے میں طاقت کا توازن ایک بار پھر امریکہ کے حق میں ہو جاے گا۔ایسی تمام تر صورت حال میں پاکستانی پارلیمنٹ کا یہ کام ہے کہ وہ ان تمام معاملات کو وہاں زیر

بحث لائے اور حکومت اور اس کے اداروں کے لیے گائیڈ لائن متعین کرے اگر عوامی نمائندوں نے صورت حال کا ادراک نہ کیا تو پاکستان ایک ایسی گہری دلدل میں دھنستا ہوا نظر آ رہا ہے کہ جس سے نکلنا اس کے لیے سالوں ممکن نہ ہو گا۔

صرف نگاہ برتنے میں ہی بہتری ہے

پاکستانی حکمرانوں کو ہمیشہ سے غیر ضروری مسائل میں الجھنے کا شوق رہا ہے یہاں کے سیاستدان بھی غیر اہم اور غیر منطقی امور میں اپنا وقت برباد کرنا ہی عبادت سمجھتے ہیں یہاں قیادت قوم کو ایسے مسائل سے روشناس کرواتی ہے کہ جن کے حل ہونے کے کوئی امکانات نہیں ہوتے ہیں اور اگر ایسے مسائل حل بھی ہو جائیں تو قوم کو ان کا کوئی خاطر خواہ فائدہ بھی نہیں ہوتا ہے اب ہمیں یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے کہ ہم کوئی مثالی ملک نہیں ہے اور کسی بھی مثالی ملک کی روایات ہم پر لاگو نہیں ہوتی ہیں قانون ،آئین اور اقدار کا درس دینے والوں کو اب اس قوم پر رحم کرنا چاہیے غیر ضروری مسائل کو اہم نوعیت کے قومی مسائل بنا کر قوم کے سامنے پیش کرنے کی اب روایت ختم ہونی چاہیے ۔برقی اور اخباری ذرائع ابلاغ کو بھی ذمہ داری کا ثبوت دینا ہو گا اور قوم کو اسے درپیش حقیقی مسائل سے روشناس کروانا ہو گا اور ان مسائل کے حل کے لیے جدوجہد کرنا ہو گی ۔ملک میں آج کل مشرف کا ہی چرچہ ہے اور یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ یہی شخص اس وقت سب سے اہم ہے قوم کے سامنے اس سے ہی متعلق سوالات رکھے گئے ہیں ان سولات کے جوابات کے ملنے یا نہ ملنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔مشرف کو سزا ہوتی ہے یا وہ ملک سے باہر جاتے ہیں اس سے قوم کی تقدیر کا کیا لینا دینا ہے اس حقیقت

سے کون انکار کر سکتا ہے کہ پاکستان میں دو متواری قوتیں نظام مملکت چلاتی رہی ہیں سیاسی اور فوجی قوت نے اس ملک پر خوب حکمرانی کی ہے جب سیاسی حکومت کرپشن کی حدیں پار کرنے لگتی ہے تو فوجی حکومت قائم ہو جاتی ہے کچھ سال وہ ملک کو ترقی کی راہ پر لانے کے لیے اقدامات کرتے ہیں پھر جب وہ بھی ملک کے لیے باعث نقصان بننا شروع ہوتے ہیں تو سیاستدان آگے بڑھ کر باگ دوڑ سنبھال لیتے ہیں کچھ عرصہ وہ قوم کے لیے کام کرتے ہیں پھر وہ راستے سے بھٹک جاتے ہیں پھر فوج کو آنا پڑتا ہے اس کھیل تماشے میں بیرونی دوست بھی سرگرم ہوتے ہیں ان کی اپنی دوستیاں اور مفادات یہاں موجود ہیں اس بات کا فیصلہ تاریخ پر چھوڑ دینا چاہیے کہ کس نے بہتر انداز میں ملک کی خدمت کی ہے ماضی میں جو کچھ ہو چکا ہے اس کو اب ہم بدل نہیں سکتے ہیں ہاں البتہ ماضی سے سبق ضرور سیکھنا چاہیے اور ایسے اقدامات سے پرہیز کرنا چاہیے جو ہمارے لیے مشکلات کا سبب بن سکتے ہیں ہمیں اپنے حافظے کو بھی مضبوط بنانا ہوگا ابھی کل ہی کی بات ہے کہ جب فوج نے اپنے تین ریٹائرڈ جنرلوں کو دوبارہ یونیفارم پہنا کر اپنے مرکزی دفتر میں بیٹھا رکھا ہے سول تحقیقاتی ادارے ان سے این ایل سی میں کرپشن کے کسی مقدمے میں ملوث ہونے پر سوالات کرنا چاہتے تھے اب ان کا کیا ہوا کسی کو معلوم نہیں ہے آئین اور قانون کی بالادستی کی بات کرنے والوں کو اس سمیت تمام دیگر امور بھی ذہن میں رکھنے چاہیے ہمارے ہاں بہت سے امور پر صرف نگاہ برتی جاتی رہی ہے اور اسی فارمولے کے تحت آگے کی طرف

کا سفر جاری رہا ہے لہٰذا مشرف کے مسلے پر اتنا واویلا کیسا ہے ؟ماضی کے واقعات سب کچھ بتاتے ہیں تاریخ میں اس مقدمے کا فیصلہ بھی موجود ہے ذرا دھیان دینے کی ضرورت ہے اور تاریخ یہاں بھی اپنے آپ کو دہرائی گی کیونکہ اب تک اس مقدمے کے تفتیش کار سابق وزیر اعظم چوہدری شجاعت کے بیان کو اس مقدمے کا حصہ نہیں بنا رہے ہیں اس بیان کے مطابق تین نومبر کے مشرف کے فیصلے میں پوری کابینہ کی مشاورت شامل تھی یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسے مقدمے میں سیاستدان تو صاف بچ جائیں اور ایک یونیفارم پر سن پھانسی پر لٹک جائے کیا ایسا کوئی ہونے دے گا؟آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمیں اپنی قوم اور ملک کے مستقبل کی فکر کرنی چاہیے اور ان کے بارے میں سوچنا چاہیے جمہوریت ہی بہترین انتقام ہے ہمیں اس فلسفے کو سمجھنے کی ضرورت ہے ہمیں حقیقی معنوں میں جمہوری سوچ اپنانے کی ضرورت ہے ہماری 66 سالہ تاریخ میں سیاستدانوں کی کارکردگی کو بھی پرکھنا ہوگا اگر ان کا کردار مثالی ہوتا تو آج ملک میں آئین اور قانون کی یوں پامالی نہ ہوتی ۔سیاستدان اپنے عوام کے لیے کچھ غیر معمولی کام کر ہی نہیں سکے جس کی بدولت غیر سیاسی قوت کا خوف ان پر بھاری ہے اگر ہمارے ملک کی سول قیادت آج بھی پاکستان کے عوام کے لیے دل و جان سے خدمت کا عہد کرے تو یقینا ان کے لیے آسانیاں پیدا ہوں گی۔جب سیاسی دور میں عوام غربت ،افلاس مہنگائی،لاقانونیت،دہشت گردی کی چکی میں پستے ہیں تو وہ دوسری قوت کی طرف دیکھتے، ہیں آج ملک میں توانائی کا ایک بحران موجود ہے

بجلی اور گیس مکمل غائب ہے عوام بھوک اور غربت سے نڈھال ہیں نئی حکومت بھی اب تک ان کے لیے کچھ نہیں کر سکی ادھر اُدھر کی باتوں کے سوا انہیں نے دیا ہی کیا ہے لہٰذا آج حکومت اور سول قیادت کو چاہیے کہ وہ آرٹیکل 6 کی بجائے عوام کی حالت زار پر توجہ دیں اگر سیاست دان عوام کی خلوص نیت کے ساتھ خدمت کریں گے تو پھر کسی کو جمہوریت پر شب خون مارنے کی ہمت نہ ہو گی اور اگر وہ یوں ہی مایوس کرتے رہے تو آرٹیکل 6 کل بھی موجود تھا اور کل بھی یہ مارشل لاء کا راستہ نہیں روک سکے گا۔

چراغ سب کے بجھیں گے

علم عمرانی کے مطابق کسی بھی ریاست کے قیام کے لیے چار عناصر کا ہونا لازمی ہے۔ علاقہ، آبادی، حکومت اور اقتدار اعلیٰ وہ چار عناصر ہیں جو کسی بھی ریاست کی بقا کے ضامن ہوتے ہیں ان میں سے کسی بھی ایک عنصر کے قائم نہ ہونے سے ریاست کا وجود باقی نہیں رہتا ہے اور آج کے اس جدید دور میں بغیر ریاست کے زندگی کا تصور ناممکن ہے مغربی عمرانی افکار کے مطابق اقتدار اعلیٰ عوام ہوتے ہیں مگر ہمارے ہاں اقتدار اعلیٰ سے مراد خدا کی ذات لی جاتی ہے گویا ہمارے ہاں تصور ریاست میں ہر کوئی خدا کی ذات کو ہی جوابدہ ہے اور ہر کسی سے اس کے امور کے بارے میں یوم حساب کو ضرور پوچھا جائے گا پاکستان کو ایک اسلامی ملک سمجھا جاتا ہے اور اس کا سرکاری اور آئینی نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے گویا یہاں پر حکومت اور اس کے ادارے اور ان میں کام کرنے ولا ہر کوئی اپنے اعمال کے بارے میں خدا کو لازمی جوابدہ ہے اگر آج ہم پاکستانی ریاست کا بغور مطالعہ کریں تو اس سے متعلق کئی ایک سوالات ضرور سامنے آتے ہیں پاکستانی ریاست میں علاقہ بھی ہے اور آبادی بھی ہے اقتدار اعلیٰ پر سب کا یقین بھی ہے اور ایمان بھی ہے مگر حکومت کی موجودگی پر ہی سب سولات اٹھ رہے ہیں کیا آج حکومت کی اپنے علاقے اور لوگوں

پر کوئی گرفت ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ جس نے اس ریاست کی بقا پر خود ایک سوالیہ نشان چھوڑ رکھا ہے ملک میں طالبان کی موجودگی اور ان کے اثر و رسوخ نے ریاست پر حکومتی گرفت کے بارے میں بھی کئی ایک سوالات کو جنم دیا ہے اگر آج یہ کہا جائے کہ ملک میں دو متوازی نظام ہائے حکومت چل رہے ہیں تو یہ بے جا نہ ہوگا طالبان ملک میں جب اور جہاں چاہتے ہیں کاروائیاں کرتے ہیں اب وہ نظام مملکت میں طاقت کے زور پر مداخلت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اب ہر روز درجنوں پاکستانیوں کو موت کی وادی میں بھیجنا حکومت کی رٹ کو چیلنج کرنے کے ہی مترادف ہے اپنے غیر موافق مسلک کے لوگوں کا بھرپور قتل عام حکومت پر ان کے بھاری ہونے کی ہی علامت ہے فورسسز پر آئے روز ان کی کاروائیوں نے ہمارے جوانوں کے حوصلوں کو پامال کیا ہے اب ہمیں کسی کو شہید یا جاں بحق لکھنے کے لیے ان ہی کی طرف دیکھنا پڑتا ہے میڈیا پر عمل کرنا پڑتا ہے پاکستانیوں کے ذہنوں میں یہ SOP پر حملوں کے بعد اب ان ہی کے سوال ضرور جنم لیتا ہے کہ ان کی فوج کے سابق سربراہ اور صدر کے خلاف تو آرٹیکل 6 حرکت میں آتا ہے اور آئین پر پورے زور شور کے ساتھ عمل کرنے کی بات کی جاتی ہے مگر ملک میں دہشت گردی کی کاروائیوں کا برملا اعتراف کرنے والوں کے ساتھ مذاکرات کا نوحہ پڑھا جاتا ہے کہا جاتا ہے اور وہاں آئینی ضرورتوں کو پورا کرنے کی بات کیوں نہیں کی جاتی ہے جس دن سے ملک میں دہشت گردی کی کاروائیاں شروع ہوئی ہیں اس دن سے ہی ایک سوچ کے حامل لوگ طالبان سے مذاکرات کو ڈھنڈورا پیٹ رہے

ہیں حالیہ مسلم لیگ ن کی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی مذاکرات کی الف لیلا نے کافی شہرت پائی اور ہر طرف سے مذاکرات کرنے کا شور بلند ہوا مگر اب وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ ہم نے صرف وقت ہی برباد کیا ہے اور انہیں مضبوط ہونے کا موقع فراہم کیا ہے عمران خان، فضل الرحمان ، سمیع الحق کوئی قابل ذکر کردار ادا نہ کر سکے یہ لوگ خواہ مخواہ ان کے لیے رائے عامہ ہموار کرتے رہے مگر انہوں نے ان کو بھی خاطر میں نہیں لایا ہے موجودہ حکومت کا خیال ہے کہ وہ ملک میں سرمایہ کاری کے ذریعے انقلاب برپا کر دے گی تو یہ اس کی خام خیالی ہے موجودہ حالات میں یہاں سرمایہ کاری کیے لیے تو کیا کوئی سیر و سیاحت کے لیے بھی نہیں آتا ہے اور اگر کوئی ہسپانوی سائیکلیسٹ بھولے سے پاکستان میں داخل ہوا بھی ہے تو اسے گولیوں سے زخمی کر دیا گیا ہے اب اگر فوج نے کچھ کاروائی ان دہشت گردوں کے خلاف کی ہے تو اس پر جن لوگوں نے افسوس کا اظہار کیا ہے انہیں اب اپنے نظریے پر نظرثانی کرنا ہو گی خود حکومت کو بھی اپنے موجودہ طرز عمل پر سوچنا ہو گا اب قوم اپنے وزیر داخلہ کو تلاش کر رہی ہے بطور اپوزیشن لیڈر آگ کے گولے برسانے والے اب معلوم نہیں کس بینکر میں جا کر چھپ بیٹھے ہیں اگر حکومت اس معاملے میں یوں ہی گم سم رہی تو پھر ریاست کا وجود خطرے میں اور اگر اس ریاست کو بچانے کے لیے کوئی اور ادارہ آگے بڑھا تو قوم اس کے ساتھ ہی ہو گی ویسے بھی اب لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حکومت پر انہی لوگوں کی گرفت مظبوط ہوتی جا رہی ہے جنہوں نے عدالت میں پیشی کے

وقت مشرف کا راستہ تبدیل کیا تھا آج سیاسی حکومت کے لیے ایک بڑا چیلنج درپیش ہے
حکومت سمیت طالبان سے مذاکرات کے حامی لوگ معلوم نہیں کس خوش فہمی میں مبتلا
ہیں انہیں ملک میں لگی ہوئی آگ کیوں محسوس نہیں ہو رہی انہیں ملک میں بہتا ہوا خون
کیوں نظر نہیں آ رہا ہے؟ اگر ان کے ذہنوں میں یہ بات ہے کہ ان کے آنے سے امن
ہو جائے گا اور یہ بچ جائیں گے تو یہ ان کی بھول ہے کیونکہ

میں آج زد پہ اگر ہوں تو خوش گماں نہ ہو
چراغ سب کے بجھیں گے ہوا کسی کی نہیں

مصیبت کے یہ دن دیکھنا ہوں گے

پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد کو اس وقت یہ فکر لاحق ہے کہ اس ملک کو درپیش دہشت گردی کے خطرے سے کس طرح نبرد آزما ہوا جائے یقینا یہ فکر اب فطری ہے ملک کی بقا اور اس کی سلامتی کے لیے موجودہ بدامنی اور دہشت گردی سے جان چھڑانا ہو گی یہ سلسلہ اب مزید نہیں چل سکتا ہے طالبان نے جب سے پاکستانی ریاست کی گرفت کو للکارنا شروع کر رکھا ہے یہاں دو طرح کی آراء موجود رہی ہیں ایک ان سے مذاکرات کے ذریعے معاملات کو سدھارنا چاہتے رہے ہیں جبکہ دوسرا گروہ طاقت کے استعمال کو ہی ان سے نجات پانے کا واحد حل تصور کرتے رہے ہیں ان دو طرح کی آراء نے قوم کو ایک مغالطے کا شکار کیے رکھا ابتدا میں طاقت کے ذریعے دہشت گردوں کو دبانے کی کوشش کی گئی مگر ان کی کاروائیاں بڑھتی گئی پھر مذاکرات کرنے کی آواز پیدا ہوئی اور شدت پسندوں کے لیے عوام میں نرم گوشہ پیدا کرنے کی کوشش بھی کی گئی اچھے اور برے طالبان کے ناموں سے بھی قوم کو روشناس کروایا گیا

درحقیقت یہاں یہ دونوں کلیے اب تک ناکام رہے ہیں یا ان کو خواہ مخواہ ناکام بنایا جا تا رہا ہے اور قوم کی سوچ کو بھی تقسیم کیا گیا ہے یہاں یہ ضروری تھا کہ دہشت گردی سے نبٹنے کے لیے دونوں کُلیے متوازی اپنائے جاتے جو گروہ مذاکرات کی میز پر آتے ان سے مذاکرات کیے جاتے اور جو طاقت کی زبان سمجھتے

ان سے طاقت کے زور پر نبٹا جاتا مگر ہمارے ہاں وقت ضائع کیا جاتا رہا اور معصوم اور بے گناہ پاکستانیوں کو مرنے کے لیے بے آسرا چھوڑ دیا گیا ریاست نے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی اور یہاں کی حکومتیں مصلحتوں کو شکار رہی ہیں یہاں جمہوری اشرافیہ اور مقتدرہ اس غدر کی آڑ میں اپنے اپنے مفادات کی تکمیل کرتے رہے جبکہ ریاست تباہ ہوتی رہی اور عوام مرتے رہے۔اس سب کی بنیادی وجہ یہ رہی ہے کہ تمام فیصلے عوامی خواہشات کے برعکس کیے جاتے رہے اور عوامی نظریات اور سوچ کو کبھی بھی اہمیت نہیں دی گئی ملک میں موجود مجلس شوریٰ کی حثیت عضو معطل کی سی رہی ہے اگر یہ معاملہ پاکستان کی مجلس شوریٰ کی مشاورت اور ترتیب کردہ حکمت عملی سے حل کیا جاتا تو مسائل اب اتنے سنگین نہ ہوتے مگر افسوس اس ملک میں حقیقی جمہوریت کو عوام سے کوسوں دور رکھا گیا ہے قوم کو یہ بتایا جاتا رہا کہ جب تک اتفاق رائے نہ پیدا ہو جائے دونوں میں سے کوئی کام نہیں کیا جا سکتا گویا صرف تباہی اور بربادی کو قبول کیا جا سکتا ہے پاکستانی قوم صرف امن چاہتی ہے اور وہ اپنے آنے والی نسلوں کا مستقبل محفوظ چاہتی ہے انہیں آج اپنی جان کی فکر لاحق ہے امن کیسے ہو اب انہیں طریقہ کار سے کوئی غرض نہیں ہے بس وہ صرف امن چاہتے ہیں ہاں البتہ عوامی نمائندوں کی سوچ اس وقت سب کے سامنے ظاہر ہوئی جب مسلم لیگ ن کی پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں انہیں بولنے کا موقع ملا سب ارکان نے دہشت گردوں کے خلاف طاقت کے استعمال کو ترجیح دی اور ریاست کی گرفت کو یقینی

بنانے کو کہا انہوں نے مذاکرات کے عمل کو اب مسترد کر دیا ارکان اسمبلی کے سخت رد عمل کے بعد وزیر اعظم کے رویے میں بھی تبدیلی آئی ہے اس اجلاس کے بعد نواز شریف کی مشکلات میں اضافہ ہوا ہے وہ فضل الرحمان اور ان جیسی سوچ کے حامل افراد کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتے ہیں وہ ذرائع ابلاغ میں موجود دائیں بازو کے لوگوں کی مخالفت بھی مول نہیں لے سکتے کیونکہ انہیں صحافتی جنگجوؤں کی بدولت ہی تو انہیں انتخابات میں کامیابی ملی ہے جبکہ ان کی اپنی جماعت کے اندر سے آنے والی آواز بھی ان کے لیے خطرے کی گھنٹی سے کم نہیں ہے دوسری جانب پیپلز پارٹی کے شریک چیرمین بلاول بھٹو زرداری نے برطانوی نشریاتی ادارے کو بھی ایک جاندار انٹرویو دیا ہے جس میں انہوں نے کھل کر دہشت گردوں کو للکارا ہے اور مذاکرات کے حامی سیاستدانوں کو کمزور اور بزدل کہا ہے مسلم لیگ ن کے اجلاس کی کہانی اور بلاول کے انٹرویو نے قوم کی سوچ کا پتا تو دے دیا ہے ہاں البتہ جمہوری اشرافیہ اور مقتدرہ گومگو کی صورت حال کا شکار ہیں نواز شریف ہمیشہ اپنے فیصلے مسلط کرنے کے عادی ہیں اور دوسری قوتوں کی بھی اپنی منطق ہوتی ہے بظاہر یہی لگ رہا ہے کہ موجودہ حکمرانوں سے کوئی بڑا اور جاندار فیصلہ نہیں ہو پائے گا اور حالات جوں کے توں ہی رہے گے یہ ایک تلخ حقیقت ہے مگر اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا ہے قوم کو ایسے حالات ابھی کئی سال اور درپیش رہیں گے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عوام انتخابات میں اشرافیہ کو منتخب کر کے ایوانوں میں بھیجتے ہیں اور یہ ارکان

سرمایہ داروں کے سر پر حکمرانی کا تاج سجاتے ہیں پاکستانی قوم جب تک اپنے طبقے سے
لوگ اوپر لے کر نہیں آئے گی تب تک اُنہیں مصیبت کے یہ دن دیکھنا ہوں گے۔

خوش نصیب پاکستان

آج کل پاکستان کے جو حالات ہیں اس پر پاکستان کا ہر فرد فکر مند ہے ان حالات کو دیکھ کر ہر کوئی غمگین ہے ہر دل خون کے آنسو رو رہا ہے عام آدمی کے جذبات کو سمجھا جا سکتا ہے اسلام آباد کچہری کے واقعہ نے سب کو ہلا کے رکھ دیا ہے۔امن و امان کی صورت حال پر ہر کوئی پریشان ہے ملک کے کسی بھی کونے میں اب کوئی بھی محفوظ نہیں ہے حکمرانوں کی صلاحیتیں کھل کر سامنے آئی ہیں مذاکرات یا آپریشن قوت فیصلہ کی کمی کا اب سب کو پتا چل گیا ہے حکومت تذبذب کا شکار ہے کہ کوئی چال تو نہیں چل رہا ہے کیا کہنے ان کی عقل کے کہ ابھی تک دشمن کو نہیں پہچان سکے ہیں دہشت گرد اس طرح ان کے اعصاب پر سوار ہوئے ہیں کہ ان کی بوکھلاٹ اب ان سے چھپائی بھی نہیں جاتی ہے امریکہ، بھارت، روس اور اسرائیل کی سازشوں کا انہیں کیا معلوم ہو گا یہ تو اب تک طالبان ، لشکر جھنگوی، جنداللہ، جنود الحفصہ اور احرار الہند وغیرہ کے بارے میں بھی کچھ نہیں جان سکے ہیں کون کیا اور کہاں ہے انہیں کچھ معلوم نہیں ہے وزیر داخلہ پریس کانفرسوں ،اور پارلیمنٹ کے اجلاسوں میں دہشتگردوں کے خلاف بیانات کے گولے داغتے پھرتے تھے انہوں نے ایسا جوابی تھپڑ ان کے منہ پر رسید کیا ہے کہ موصوف اپنے سرخ گال کو اپنے غصے سے تعبیر کرتے پھر رہے ہیں

بلند و بالا دعوے سب ریت کی دیوار ثابت ہوئے ہیں پر شرم ہے کہ ان کو نہیں آتی ہے حکمران ہر شعبہ میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں ہر میدان میں ان کی نااہلی ثابت ہوتی چلی جارہی ہے حکومت کئی ماہ سے 23 آئینی اور خود مختار اداروں کے سربراہوں کا تقرر نہیں کر سکی ہے ہسپتالوں میں ادویات موجود نہیں ہے۔ سندھ کے ضلع مٹھی میں بچے غذائی قلت کے باعث موت کی وادی میں چلے گئے ہیں اور یہ بحران روز بروز 32 بڑھتا جارہا ہے بجلی، گیس اور تیل کی قیمتوں میں آئے روز اضافہ کیا جاتا ہے عام آدمی کا اب سانس لینا دشوار ہو چکا ہے کون کون سا نوحہ لکھا جائے اور کیسا کیسا مرثیہ پڑھا جائے یہاں تو ہر شام، شام غریباں ہے اور ہر روز، روز عاشور ہے مصیبت کی کربلا ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی ہے کہا جاتا ہے کہ ناامیدی گناہ ہے یہ درست ہے مگر ان حکمرانوں سے خیر کی توقع کرنا بھی عبث ہے حکمرانوں سے مراد سب ہیں دائیں بازو کے لوگ بھی اور بائیں بازو کے افراد بھی فوجی حکمران بھی اور ٹیکنوکریٹ بھی سب ہی دیہاڑی دار مزدور ہیں قیام پاکستان سے لے کر آج تک ہر کسی نے اپنی اپنی دیہاڑ لگائی ہے اور پھر وہ چلتا بنا ہے کسی نے بھی مستقل بنیادوں پر اس ملک کے لیے کوئی کام نہیں کیا ہے مگر قدرت ہم پر بار بار مہربان ہو جاتی ہے اور عالمی حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ بیرونی قوتوں کو ہماری ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے اسی ضرورت کے عوض وہ ہمیں پیسے دیتے ہیں اور ہماری روزی روٹی چلتی رہتی ہے اور یہاں کی اشرافیہ کے کاروبار پھلتے پھولتے

رہتے ہیں قیام پاکستان کے بعد امریکہ کو ہماری ضرورت تھی ہم سے سیٹو اور سینٹو معاہدے کروائے گے ان معاہدوں کے بعد ہماری اقتصادی ترقی کی رفتار بھی تیز ہوئی اور دفاعی قوت میں بھی اضافہ ہوا مگر جب ان کی ضرورت ختم ہوئی اور مسلہ کشمیر اور 65 کی جنگ میں ہمیں ان کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ غائبس ہو گئے اس دوران پھر ہم لڑتے مرتے رہے ملک دو ٹکڑے ہو گیا اور ہم جمہوریت آمریت کا کھیل کھلتے رہے پھر بھلا ہو روس کا کہ اس نے افغانستان پر چڑھائی کر دی اور دنیا کو ایک بار پھر ہماری ضرورت محسوس ہونے لگی جہاد افغانستان کے نام پر بے پناہ پیسہ اس ملک میں آیا سب نے خوب مال بنایا اور صدقہ کھانے والے بھی ڈالر لینے لگے روس کے ٹوٹنے کے بعد پھر ہم اسی حالت میں واپس چلے گئے نواز شریف اور بینظیر جمہوریت کا کھیل کھیلتے رہے پھر قدرت ہم پر مہربان ہوئی اور 11/9 کا واقعہ پیش آگیا اور دنیا کو پھر ہماری ضرورت پڑ گئی مشرف آگے دنیا نے ہمیں اتنا پیسہ دیا کہ سب کا خوب کاروبار چمکا جنرل نے اس بار سب کو باہر کی اس دولت میں خوب نہلایا مگر جب دنیا کو ہماری ضرورت نہ رہی تو نہ ہی جنرل رہا اور نہ ہی پیسہ اور امن ۔ہم ایک بار پھر اپنی اصلی حالت میں لوٹ گئے۔ آج قدرت ایک بار پھر ہم پر مہربان ہونے جا رہی ہے مایوسی کی ضرورت نہیں ہے امید کی کرن پیدا ہو چکی ہے نئی سرد جنگ کی ابتدا ہونے جا رہی ہے یو کرائن کا مسلہ سر اٹھا رہا ہے روس اور امریکہ ایک بار پھر مد مقابل آ رہے ہیں ملک شام میں بھی ہماری ضرورت محسوس کر لی گئی

ہے بحرین میں ہم نے اپنے بندے پہلے ہی بھیج رکھے ہیں سعودی عرب بھی ہماری طرف
دیکھ رہا ہے۔ ہم ایک بار پھر عالمی طاقتوں کی ضرورت بنتے جا رہے ہیں اور اب ہمیں
۔ ایک بار پھر سنبھالا دینا ان کی ضرورت ہے اور یہی پاکستان کی خوش نصیبی ہے

احساس زندگی کا۔۔۔۔

اگر موجودہ دور کو انتشار کا دور کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔آج کل انسانی معاشرہ انتشار اور ابدامنی کا شکار ہے۔ سکون،احترام انسانیت،مساوات،اخوت،بھائی چارہ،ضرورت مندوں کی معاونت اور یتیموں کی پرورش جیسے الفاظ اب روز مرہ زندگی میں کم ہی سننے کو ملتے ہیں مادہ پرستی اور دنیاوی ہوس نے آج کے انسان کو جکڑ رکھا ہے۔ظلم ہے کہ آکاس بیل کی مانند پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے آج کا انسان اپنے مقصد اور منزل سے دور ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے جبکہ انسان کو تخلیق کرنے کا مقصد ایک یہ بھی تھا کہ وہ اس کائنات میں تعمیری سرگرمیوں میں حصہ لے اور تخریبی کاموں سے اجتناب کرے تعمیری اور مثبت امور کی بجاآوری رحمان کی خوشنودی کا سبب بنتی ہے جبکہ تخریبی کام شیطان کی راہ پر چلنے کا سبب بنتے ہیں جس کی آخری منزل جہنم ہے خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر اس دنیا میں بھیجا ہے اور اس سے توقع بھی یہی کی جاتی ہے کہ اس کے تمام اعمال خدا کے پسندیدہ ہوں۔اس کے پسندیدہ اعمال میں سے سب سے اچھا عمل انسانیت کی خدمت ہی ہے۔پر امن اور فلاحی معاشرہ کے قیام کا خواب انسان کا سب سے پرانا اور بنیادی خواب ہے مگر اس کی تعبیر صرف اسی وقت ممکن ہے جب تمام انسانوں کے ساتھ برابری اور مساوات کا سلوک روا رکھا جائے اور یہ اسی

وقت ممکن ہے جب وسائل کی مساویانہ تقسیم ہو۔ خاتون جنتؐ کا قول ہے کہ جب تم کسی بھوکے کو دیکھو تو یہ مت سمجھو کہ خدا کے ہاں رزق کی کوئی کمی ہے بلکہ یہ جان لو کہ کسی نے اس کا حق غصب کر رکھا ہے۔ ہمیں اس فرمان کو سمجھنے کی ضرورت ہے ایک فقرے پر مشتمل اس فرمان کے اندر حکمت کی کئی باتیں پوشیدہ ہیں۔ جب افراد اپنے فرائض ادا کرنے اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے سے غافل ہونے لگیں تو معاشروں میں ظلم جنم لینے لگتا ہے اور انتشار و بدامنی اپنی جگہ بنانے لگتے ہیں۔ مظلوموں اور کمزوروں کے حقوق غصب ہونے لگیں تو غربت اور بھوک جنم لینے لگتی ہے ایسے میں یہ ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ اپنی طرز زندگی کا خود جائزہ لے اور اپنے افعال اور اعمال کا خود تجزیہ کرے اور یہ دیکھے کہ وہ کہیں کوئی ظلم کرنے کا سبب تو نہیں بن رہا ہے اپنے ذمے واجبات کو ادا نہ کرنا بھی ایک ظلم ہے کیونکہ اپنے مالی واجبات ادا نہ کرنے سے مستحقین مشکلات کا شکار ہو جاتے ہیں اور بھوک اور غربت ان کا مقدر بن کے رہ جاتی ہے اسی لیے مذکورہ فرمان کو مد نظر رکھ کر ہمیں اپنا طرز زندگی بدلنا ہوگا اور انسانیت کی خدمت اور فلاح کے لیے بھی کچھ کر گزرنا ہوگا پاکستانی معاشرے کی یہ خوش قسمتی ہے کہ یہاں اس پر آشوب دور میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو حق داروں کو ان کا حق دلانے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں ایدھی صاحب کا نام سب سے اوپر ہے جو انسانیت کی خدمت کے لیے اپنی مثال آپ ہیں اور اب وہ دوسروں کے لیے قابل تقلید بن چکے ہیں میرے شہر چکوال میں

ایک صاحب لیاقت علی ہیں جنھوں نے انسانیت کی خدمت کرنے کا عزم کیا اور اب وہ اس میدان میں کافی سرگرم ہیں چکوال میں موجود یتیم بچیوں کو سہارا فراہم کرنے کے لیے انھوں نے ایم نذیر ایجوکیشنل ٹرسٹ کے نام سے ایک ادارہ بنا رکھا ہے مجھے اس ادارے کا دورہ کرنے کا موقع ملا یہاں یتیم اور بے آسرا لڑکیوں کو رہائش، کھانا، تعلیم، کپڑے اور ادویات مفت فراہم کی جاتی ہیں ان کی عزت نفس کا بھی خصوصی خیال رکھا جاتا ہے زندگی کی خوشیوں سے محروم ان بچیوں کو تحفظ، آسرا اور خوشیاں واپس لوٹانے کے لیے یہ ادارہ انتہائی خلوص اور لگن کے ساتھ اپنے فرائض ادا کر رہا ہے اس ادارے کی کارکردگی، معیار اور سسٹم نے مجھے کافی متاثر کیا میں نے ایک امید کی کرن یہاں سے پھوٹتی ہوئی دیکھی ہے جو یقیناً آگے چل کر دوسروں کے لیے مینار نور ثابت ہوگی۔ میرے لیے یہ بات حوصلہ افزاء تھی کہ آج کے اس انتشار اور بدامنی کے دور میں بھی کچھ افراد اور ادارے ایسے موجود ہیں جو اپنا فرض اور دوسروں کے حقوق بھی ادا کر رہے ہیں۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرے کے دیگر افراد بھی ان کے نقش قدم پر چلیں انسانیت کی خدمت کے لیے اپنا کردار ادا کریں ہمیں اپنے واجبات ادا کرنے ہوں گے ان جیسے اداروں کی مالی معاونت کرکے ہم ظلم سے بچ سکتے ہیں اور بے آسرا لوگوں کے لیے سہارا بن سکتے ہیں جب معاشرے کے تمام افراد اپنے فرائض ادا کرنے لگیں گے تو یہ معاشرہ ایک فلاحی معاشرہ بن جائے گا جب دوسروں کی زندگی کا احساس انسان کے اندر جگمگانے لگ پڑے تو معاشرے سے محرومی اور

بھوک کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور خدا کا قرب بھی حاصل ہوتا ہے بات صرف احساس کی ہے۔

مسلم امہ کی حقیقت اور آج کا مسلمان

ایک عمومی تاثر یہ ہے کہ آج پورا عالم اسلام ہمہ گیر زوال کا شکار ہے مسلمانوں کو ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کس حد تک یہ تاثر درست ہے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے جو حالت مسلمانوں کی آج ہے اس کے کچھ وہ خود ذمہ دار ہیں اور باقی دشمنوں کا کیا دھرا ہے اسلام دشمن قوتوں نے تو مسلم امہ کو کمزور کرنا ہی ہے مگر اب وہ اسلام کا مذاق بھی اڑانے لگے ہیں مغرب جو عالمی معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے اس میں مسلمانوں کا کوئی کردار نہیں ہے اور دوسری طرف امریکہ اور مغرب کے نئے عالمی نظام میں مسلمان ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں عالمی امن و سلامتی ،ترقی، خوشحالی اور اس دنیا کے تمام مسائل کا حل اسلام کے پاس موجود ہے اور اسی کی دنیا کو تلاش ہے اگر مغرب یہ سمجھتا ہے کہ وہ نیا عالمی معاشرہ مسلمانوں کے کردار کے بغیر تعمیر کر سکے گا تو یہ اس کی بھول ہے آج کے مسلمان کی کمزور حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ اسلام سے جدا ہو گیا ہے جب تک ہم حقیقت اسلام سے وابستہ رہیں گے ہم پر زوال نہیں آ سکتا ہے قرآن میں یہ وعدہ کچھ یوں بیان ہوا ہے اگر تم باایمان رہو گے تو تم ہی سرفراز رہو گے۔جب ہم نظریاتی اور عملی سطح سے اسلام سے دور ہوتے ہیں تو ہمیں زوال سے دوچار ہونا پڑتا ہے اگرچہ مسلمانوں نے ایک ہزار سال حکومت بھی کی ہے مگر

اسلام کو صرف حکومت اور سیاست سے جوڑنا مناسب نہیں ہو گا اسلام انفرادی زندگی خانوادگی زندگی اور معاشرتی زندگی میں بھی ہمارا رہنما ہے ہم حکومت کریں یا نہ کریں دونوں صورتوں میں ہم مسلمان رہ سکتے ہیں لیکن یہ تصور کر لینا کہ ہم حکومت نہیں کر رہے تو گویا ہم اسلام سے دور ہیں یہ تصور عجیب لگتا ہے مسلمانوں نے جب تک خدمت اور اخلاق کے جذبے سے سرشار ہو کر حکومت کی وہ باعزت بھی رہے اور باکمال بھی ۔جب تک وہ خالص اسلامی اصولوں پر کاربند رہے کامیابیاں ملتی رہیں اور جب مسلمانوں نے اسلام کی تعلیمات کو چھوڑ کے ملوکیت کو اپنایا وہی سے زوال نے انہیں آ لیا اور وہ اس کا شکار ہوتے چلے گئے آج مسلمانوں کو قرآن کی طرف واپس پلٹنا ہو گا وہی ان کا رہنما ہے اسے پوری معنویت کے ساتھ قبول کرنا ہو گا یہ نہ ہو کہ اس کے ایک حصے کو مانیں اور ایک حصے سے صرف نگاہ کر جائیں بلکہ اسے بحثیت کل اختیار کریں قرآن نے جو درس توحید دیا ہے اسے سمجھنے کی ضرورت ہے اور اسے اختیار کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے انسان فطرت توحید پر پیدا ہوا ہے گویا توحید انسانی فطرت میں شامل ہے لوگوں کو خدائے واحد کی طرف بلانا فطرت کی طرف واپس بلانا ہے یہی اس وقت سب سے بڑی اساس ہے حقیقت توحید سے آشنا ہو کر تمام عالم بشریت اپنے مسائل پر قابو پا سکتی ہے اگر ہم حقیقت توحید سے وابستہ ہو جائیں تو

اقتصادی، سیاسی، اخلاقی، انفرادی اور اجتماعی مسائل سے نہ صرف چھٹکارا پا سکتے ہیں بلکہ امن و سکون اور عافیت کا سامان اس دنیا میں

بھی مل سکتا ہے اور آخرت کی منزل بھی آسان ہو سکتی ہے قرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد انسان سیرت سے بے نیاز ہو سکتا ہی نہیں ہے ہر آیت سیرت سے جڑی ہوئی ہے یوں تو پوری سیرت پر عمل کرنا لازمی ہے مگر امت مسلمہ کو سیرت کا ایک ایسا پہلو ہے جسے فوراً اختیار کرنا چاہیئے آج کے حالات میں اس کی اہمیت وافادیت کافی بڑھ گئی ہے اور وہ ہے آپؐ کا عطا کیا ہوا تہذیبی رویہ۔ جو رواداری کا رویہ آپؐنے عطا کیا ہے اس کی مثال پیش کرنا ممکن ہی نہیں ہے یعنی تم دوسروں کے باطل خداوں کو بھی برا نہ کہو مبادا وہ تمھارے برحق خدا کو ناراضگی یا دشمنی کی بنیاد پر برا کہیں۔ یہ وہ عظیم الشان فکری بنیاد ہے جو فکری سطح پر تمام عالم انسانیت کو متحد کر سکتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مسلمان امت قرآن و سنت کے عطا کردہ اس تہذیبی رویے پر فکری طور پر برقرار رہی ہے اسی لیے آپ چودہ سو برس میں کوئی ایک قابل ذکر مسلمان تہذیب و ثقافت سے ابھرنے والا ادیب، شاعر یا مصنف ایسا پیش نہیں کر سکتے جس نے کسی دوسرے دین و مذہب کے رہنما کی تذلیل و توہین کے لیے قلم اٹھایا ہو۔ جبکہ اس کے برعکس دوسری طرف سے تحریروں اور خاکوں کے ذریعے کتاخیاں بھی کی گئی ہیں اور قرآن پاک کو جلایا بھی گیا ہے مسلمانوں کی طرف سے کبھی ایسی حرکت سامنے نہیں آئی یہی ایک زندہ باوقار اور ترقی کرتی ہوئی قوم کا شیوہ ہے جس پر بلاشبہ ہم ناز کرتے ہیں اب بے حرمتی کرنے والی قوموں کی ذہنی پستی کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں رہا ہے آج کل ایک تاثر یہ بھی پیش کیا جا رہا

ہے کہ مسلمان گزشتہ پانچ سو برسوں میں دنیا کو کچھ نہیں دے سکے مگر یہ درست نہیں ہے اس دنیا کی اساس قانون ارتقاء پر ہے ایک ہمہ گیر کامل وشامل اصول ارتقاء پر یہ کائنات قائم ہے اس لیے یہاں جو چیزیں بھی ہیں وہ اس ارتقائی عمل میں اپنا حصہ ضرور ڈال رہی ہیں مسلمان امت نے بھی اپنا کردار ادا کیا ہے چاہے اس کا کوئی اعتراف کرے یا نہ کرے مثال کے لیے امام خمینی کو پیش کیا جا سکتا ہے انہیں کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے وہ ایک فلسفی، عارف، صوفی اور عظیم رہنماء تھے انہوں نے عالم بشریت کو ایک نیا نظام عطا کیا جس نے ایک جامد ملک کو فعال اور ترقی پذیر بنایا اسے وہ رفتار ترقی عطا کی کہ وہ آج ترقی یافتہ ملکوں سے آنکھ ملا رہا ہے مغرب اور امریکہ کے اپنی پسند کے عالمی معاشرے کے قیام میں اس وقت ایران بڑی مخالف قوت ہے امریکہ کے توسیع پسندانہ عزائم کے مقابلے میں ایران کھڑا ہے انقلاب ایران نے دنیا میں آزادی کی تحریکوں کو ایک نئی تقویت دی ہے اسلامی انقلاب نے دنیا کو بے چین اور بے قرار کیا ہے اس اضطراب کا پیدا ہونا ہمیں یہ بتاتا ہے کہ لوگ مسلمانوں کے افکار سے متاثر ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کے موجودہ سیاسی کردار میں اصلاح کی ضرورت ہے آج مسلمانوں کو حکمرانوں اور سیاستدانوں نے یرغمال بنایا ہوا ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مسلمان کو توحید پرست ہونا چاہیئے حقیقت توحید سے آشنائی میں ہی تمام مسائل کا حل ہے اسے صرف خدا کے بنائے ہوئے اصولوں اور تعلیمات پر عمل کرنا ہوگا مگر خرابی اس وقت پیدا ہوئی جب آج

مسلمان شخصیت پرستی کی طرف راغب ہوا ہے موجودہ مسلمان لیڈروں کی اکثریت مغرب اور امریکہ نواز ہے اور ان کے پیروں کار ہر وقت آنکھیں بند کیے ان کے اشاروں پر تیار اور مستعد رہتے ہیں اس طرز عمل سے دہشت گردی اور انتہا پسندی سمیت کئی ایک برائیاں جنم لے رہی ہیں مسلمانوں میں شدت پسندی ان ہی لیڈروں کی وجہ سے آئی ہے اسلام تو انسانی جان کی قدر و قیمت سے واقف ہے اس کا تہذیبی رویہ مثالی ہے اسی لیے بڑے بڑے علما نے شخصیت پرستی کو درست نہیں جانا ہے ایک مسلمان کو توحید پرست ہونا چاہیے توحید قرآن اور سیرت کے اصول ایک مسلمان کے لیے راہ عمل ہونے چاہیے جو لیڈر ان تینوں کے بتائے ہوئے اصولوں پر چلے اس کا ساتھ دیا جائے بصورت دیگر اس سے منہ موڑ لیا جائے اسی میں مسلمانوں کی بھلائی عزت اور ترقی ہے۔

علم وادب اور فنونِ لطیفہ کی اہمیت

پاکستانی معاشرے میں تشدد کا رجحان خطرناک حد تک زور پکڑ رہا ہے آئے روز ایسے واقعات میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے کہ جن میں تشدد کا عنصر کافی زیادہ ہے لوگوں میں عدم برداشت کا مادہ زیادہ ہے اور صبر و تحمل کا فقدان ہے معاشرہ بربریت کا شکار ہے انسان انسان پر ہی ظلم کرنے سے باز نہیں آ رہا اگر ہم انسانی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ابتداء میں انسان طاقت کا بھرپور استعمال کرتا تھا دوسرے پر سبقت اور تسلط کے شوق نے اسے جنونی حد تک ظالم بنا رکھا تھا جوں جوں انسان نے علم اور آگاہی کا سفر شروع کیا اس نے اپنے اندر موجود اس صفت کو حلم بردباری برداشت اور صبر میں تبدیل کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ جن معاشروں میں علم وادب نے ترقی کی وہاں سے ظلم اور بربریت کا خاتمہ ہوتا چلا گیا قیامِ پاکستان کے وقت یہاں لوگوں کے حالات بہتر تھے اور ان کا طرزِ زندگی سلیقہ مندی کا آئینہ دار تھا مروت، بھائی چارہ، خلوص، محبت اور احترام کے رشتے موجود تھے انسان کی قدر اور شرافت کی اہمیت بھی موجود تھی اس کی بڑی وجہ لوگوں کا علم وادب اور فنونِ لطیفہ کی اعلیٰ روایات پر کاربند ہونا تھا مغلوں نے جب برصغیر پر اپنی حکومت قائم کی تو انہوں نے فن اور ادب کی سرپرستی بھی کی ان کے دور میں معاشرے میں علم وادب کو فروغ

ملاشاعری، فنِ مصوری، موسیقی، خطاطی اور رقص نے حکومتی سرپرستی میں کافی ترقی کی امیر خسرو کے دور میں شروع ہونے والا یہ سفر قیامِ پاکستان کے بعد 70 کی دہائی تک بھرپور انداز میں عوامی سطح تک جاری رہا۔ جس معاشرے میں علم وادب اور فنونِ لطیفہ رائج ہوں اور افراد کی ان میں دلچسپی ہو وہاں انتہا پسندی اور دہشت گردی کو پنپنے کا موقع نہیں ملتا لوگوں کو ان کے جذبات کے اظہار کے بھرپور مواقع ملتے ہیں ترقی پسند قوتیں پروان چڑھتی ہیں مکالمے کو فروغ ملتا ہے جس سے ایک دوسرے کے نظریات اور عقائد کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اظہارِ رائے کا طریقہ تلوار کی بجائے قلم ہوتا ہے لوگوں کی دلچسپی کے مواقع زیادہ ہونے کی صورت میں انکی توجہ انسانیت کے احترام پر مرکوز ہوتی ہے ادب اور فن نے ہمیشہ احترامِ آدمیت کا درس دیا ہے محبت، اخوت اور بھائی چارے کی فضاء برقرار رکھی ہے اہلِ ادب و فن ہمشیہ سے عدم تشدد کے قائل رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج تک اس شعبے سے تعلق رکھنے والا نہ کبھی دہشت گرد بنا ہے اور نہ ظالم انہوں نے اپنے نظریے کے پرچار کے لیے ہمیشہ قلم، برش، رنگ، مٹی وغیرہ کا استعمال کیا ہے شاعری، ڈرامہ، نثر، ناول، مصوری، مجسمہ سازی، فنِ خطاطی اور دیگر فنون ہمیشہ سے اظہارِ رائے اور نظریات کے پرچار کے موثر طریقے رہے ہیں اسی وجہ سے معاشرے میں جمہوری کلچر پروان چڑھتا ہے اور جمہوری اقدار کو فروغ ملتا ہے غیر جمہوری قوتیں ہمیشہ سے فن اور ادب کے خلاف رہی ہیں انہوں نے اس کے فروغ میں ہر طرح سے رکاوٹیں ڈالی ہیں جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے بعد پاکستانی معاشرے پر انتہا پسند اور غیر جمہوری

قوتیں آہستہ آہستہ قابض ہونا شروع ہو گئیں ان آمرانہ قوتوں نے علم وادب اور فنونِ لطیفہ پر آہستہ آہستہ پابندی لگانا شروع کر دی اور اسکی حوصلہ شکنی کی یہاں تک کہ سکولوں میں بزمِ ادب کا پریڈ تک ختم کر دیا گیا یہ سب ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت تھا جس کے تحت نئی نسل کو جمہوری سوچ اور ترقی پسند خیالات سے دور رکھنا تھا اور انہیں قدامت پسندی اور انتہا پسندی کی طرف مائل کرنا تھا یہی فرسودہ سوچ آج انتہا پسندی اور دہشت گردی کی صورت میں ہمارے سامنے ابھر کر آئی ہے۔ ایسے عناصر کا نظریہ طاقت، قتل وغارت اور کُشت وخون کے ذریعے اپنی بات منوانا اور دوسروں پر مسلط کرنا ہے جب ملک میں ایسے واقعات روز بروز ہوں گے تو عام آدمی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ان کی سوچ بھی اس ظالمانہ سوچ سے متاثر ہو گی وہ بھی اپنے عام روزمرہ کے فیصلے طاقت کے بل بوتے پر کرے گے یہی وجہ ہے کہ آج پاکستانی معاشرے میں تشدد کا عنصر کسی بھی دوسرے معاشرے سے زیادہ پایا جاتا ہے اگرچہ کے آج جمہوری دور ہے مگر سوچ وہی آمرانہ ہے حکمران ذہنی طور پر ملوکیت کے دلدادہ ہیں نام اور نظام بدلنے سے سوچ وفکر تبدیل نہیں ہوتی موروثی سیاست اور حکمرانی نے بھی پاکستانی معاشرے کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے چند خاندانوں کے کی حکمرانی نے بھی مایوسی کو فروغ دیا ہے مفاہمت مافیہ نے اخلاقی قدروں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے عام آدمی کی سیاست اور ملکی امور سے دوری نے بھی معاشرتی رویوں میں بگاڑ پیدا کیا ہے آج پوری پاکستانی قوم کو آمرانہ سوچ اور ملوکیت نے یرغمال بنا رکھا ہے جبر اور تشدد کا نظریہ پاکستانی

معاشرے میں سرائیت کر چکا ہے جس کا انجام ایک خطرناک تباہی کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ موجودہ انسانی رویوں اور اخلاقی قدروں کو بدلنے کی ضرورت ہے معاشرے سے ظلم و تشدد جبر اور نفرت کے خاتمے کے لیے اب ادیبوں، فنکاروں، دانشوروں اور دیگر فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو اپنا بھرپور کردار ادا کرنا ہوگا معاشرے میں موجود اس جمود کو توڑنا ہوگا انسانی ذہن کی فکری تربیت نہایت ضروری ہے جبر و تشدد کے مقابلے میں محبت، خلوص، پیار اور احترامِ انسانیت کے جذبے کو فروغ دینا ہوگا قانون کی حکمرانی اور صحیح جمہوری سوچ ہی معاشرے کو ترقی کی طرف لے جا سکتی ہے حکومت کی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ معاشرے میں انتہا پسندی کے بڑھتے ہوئے رجحان کو محسوس کرے اور لوگوں کی فکری تربیت صحیح معنوں میں کرے اعتدال پسندی کو فروغ دے اور اپنا کردار ادا کرے ملک میں موجود تمام سیاسی اور ترقی پسند جماعتوں کو بھی اپنا کردار ادا کرنا ہوگا اور ان کو بھی اپنے اندر سے ملوکیت کو ختم کرنا ہوگا اور جمہوری سوچ کو پروان چڑھاتے ہوئے معاشرے کو انتہا پسندی اور دہشت گردی سے بچانا ہوگا اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو کہیں خدانہ خواستہ ملک اور حکومت ان بے رحم عناصر کے سپرد ہو جائے اور اگر ایسا ہوا تو ایک طویل تاریکی ہمارا مقدر ہو گی۔

ملکی اداروں میں تناؤ کو ختم کرنا ہوگا

سیاسی جماعتوں کی اپنی ایک تاریخ ہوا کرتی ہے۔ ان کے قیام کے اسباب اور اغراض و مقاصد ہوا کرتے ہیں وہ کسی نظریے کے تحت وجود میں آتی ہیں۔ سیاسی جماعتیں اپنا کردار اور منزل متعین کرتی ہیں اور پھر اپنے اس کردار کو نبھانے اور منزل کے حصول کے لیے سیاسی انداز میں جدوجہد کرتی ہیں اپنے بنیادی نظریے اور فلسفے کے تحفظ کے لیے جماعتیں ہمیشہ سرگرم رہتی ہیں اور ان کا کردار وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ بنتا جاتا ہے۔ جو جماعت جتنی اپنے نظریے اور فلسفے کے ساتھ مخلص اور قریب ہو گی وہ اتنی ہی مضبوط اور ایک لمبے عرصے تک باقی رہے گی۔ جماعتیں اپنا نظریہ اور فلسفہ لوگوں تک پہنچاتی ہیں اور پھر وہی لوگ اس نظریے اور فلسفے کے امین ہوتے ہیں ۔اگر ہم پاکستان کی موجودہ حکمران جماعت مسلم لیگ ن کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں تو یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ یہ جماعت اقتدار میں ہمیشہ مشکلات کا شکار نظر آتی ہے۔ وفاق میں تیسری بار حکومت میں ہونے کے باوجود اسے سابقہ طرز کے مسائل کا ہی سامنا ہے۔آخر کیا وجہ ہے کہ یہ جماعت ملک اور قوم کے لیے کچھ کر گزرنے سے قاصر ہے۔ہم اگر اس جماعت کے قیام کا سبب معلوم کریں تو یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسے بنانے والے فوجی تھے میاں نواز شریف کو سیاست میں

فوجیوں نے ہی متعارف کروایا تھا اور میاں صاحب ان ہی کے لطف و کرم کے ذریعے مسلم لیگ ن بنانے میں کامیاب ہوئے دیگر اسباب اور اغراض و مقاصد کچھ یوں تھے کہ پاکستان میں بائیں بازو کی قوتوں کو آگے بڑھنے سے روکا جائے اس وقت کی مقتدرہ کی خواہش بھی یہ تھی کہ ملک میں کوئی ایسی سیاسی جماعت بھی ہو جو ان کے عزائم کی سیاسی انداز میں تکمیل کر سکے گویا یہ جماعت کسی مظبوط اور مربوط نظریے اور فلسفے کے بغیر ہی قائم ہوئی ۔پھر اس جماعت کی قیادت نے لفظوں کا بھرپور قتل عام کیا اور جمہوریت اور معاشی ترقی کا خوب راگ گایا مگر ان کے پاس نہ ہی تو کوئی جمہوریت کا فلسفہ تھا اور نہ ہی کسی معاشی نظام کا خاکہ موجود تھا۔ملک کے تعلیمی اداروں میں پڑھائے جانے والے نصاب میں مسلم لیگ کا تذکرہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہے قیام پاکستان میں اس جماعت کا کردار ایک تاریخی حقیقت ہے مگر قیام پاکستان کے بعد اس کا کردار کوئی قابل ذکر نہیں ہے گویا تعلیم حاصل کرنے والی نسل اور ہمارے بزرگوں کی مسلم لیگ کے ساتھ جذباتی وابستگی قائم رہی اور یہ وجہ اس کے مظبوط ووٹ بینک کا سبب بنی رہی مگر اب صورت حال بدلتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ مسلم لیگ معاشی ترقی کا شور تو مچاتی ہے مگر اس کے پاس کوئی معاشی نظام موجود نہیں ہے جس ترقی کا وہ واویلا کرتے ہیں درحقیقت وہ سرمایہ دار کی ترقی ہے اور ملک میں سرمایہ دارنہ نظام کو تقویت مل رہی ہے۔جب یہ جماعت اقتدار میں ہوتی ہے تو اس کی تمام تر توجہ اپنے اور اپنے چند حلیفوں کے سرمائے میں اضافے پر مرکوز

ہوتی ہے جبکہ مملکت کے معاملات چلانے کے لیے کئی اہم پالیسیوں کی ضرورت ہوتی ہے ملک میں موجود معاملات کو اپنے نظریے اور فلسفے کے تحت چلانا ہوتا ہے اس کے لیے ایک سوچ اور فکر کو پروان چڑھانا ضروری ہوتا ہے جبکہ ن لیگ کی سوچ ایک مخصوص نقطے تک محدود ہے یہ وجہ ہے کہ ملکی معاملات میں اس کے دیگر اداروں کے ساتھ اختلافات اور کھچاؤ ہمیشہ موجود رہتا ہے ماضی میں بھی عدلیہ اور فوج کے ساتھ تعلقات کی کشیدگی ان کے اقتدار سے الگ ہونے کا سبب بنی اور اب ایک بار پھر یہ فوج کے ساتھ غیر مطمئن ہیں اس کا اعتراف 14 اپریل کے اخبارات میں چوہدری نثار نے اپنے ایک بیان میں بھی کیا ہے آج ہر قسم کے ذرائع ابلاغ میں یہی شور بلند ہے اس شور سے قوم پریشان ہے لوگ مختلف قسم کے اندازے لگا رہے ہیں۔اب محسوس یہ ہو رہا ہے کہ دو ملکی قوتوں کے درمیان طبل جنگ بجنے ولا ہے تاثر کچھ ایسا دیا جا رہا ہے کہ کچھ مختلف ہونے جا رہا ہے یہ سب کچھ نہ ملک کے مفاد میں ہے اور نہ ہی قوم کے مفاد میں ہے میاں نواز شریف پر یہ بھاری ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا بھرپور کردار ادا کریں سرمایہ دارنہ سوچ کو بدلیں اپنی جماعت کو کسی مربوط نظریے اور فلسفے کے تحت چلائیں۔

جماعت اور عوام میں نظریات کو فروغ دیں اگر ان کی جماعت شخصیت پرستی اور سرمایہ دارانہ سوچ سے پاک ہوتی تو ان کے وزراء اس طرح کے بیانات نہ دیتے۔وزیراعظم کو فوری طور پر قوم سے خطاب کرنا چاہیے اور ملکی معاملات پر ایک منظم پالیسی کا اعلان کرنا چاہیے اپنی جماعت کے لیے ایک مربوط نظریے کی

بنیاد رکھنی چاہیے تاکہ اداروں کو بھی معلوم ہو کہ انہوں نے طالبان اور دہشت گردوں کے ساتھ کیا کرنا ہے مزید وزیراعظم خواجہ سعد رفیق اور خواجہ آصف کو فوری طور پر جی ایچ کیو بھیجیں اور وہ وہاں شہدا کی یادگار پر فاتحہ بھی پڑھیں اور انہیں سلامی بھی دیں اسی طرح ملک میں موجود اداروں کے درمیان تناؤ کو ختم کیا جا سکتا ہے اور قوم کو ذہنی کشمکش سے نکالا جا سکتا ہے۔

پارلیمنٹ اور میڈیا کا کردار

حامد میر پر قاتلانہ حملے کے بعد ملک میں ایک ایسی بحث شروع ہو گئی ہے جس سے ملکی اداروں کے درمیان تناؤ میں اضافہ ہوا ہے۔ معاملات ہیں کہ سدھرنے کی طرف جا ہی نہیں رہے ہیں۔ ابھی فوج اور حکومت کے درمیان تعلقات میں کچھ قلق کی بازگشت باقی تھی کہ میڈیا نے مزید غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔ حامد میر نے اپنے حملے سے پہلے جن خدشات کا اظہار ایک غیر ملکی صحافتی تنظیم سے خفیہ انداز میں کیا تھا اگر وہ یہی بات پاکستانی عدلیہ اور قانون نافذ کرنے والے سول اداروں کے سامنے کھل کر کرتے تو ان کی نیت پر شک نہیں کیا جا سکتا تھا مگر اب صورت حال مختلف ہے وہ نجی طور پر اپنے صحافتی دوستوں سے اس خدشے کا اظہار تو کرتے رہے مگر اپنے ایوان اقتدار میں بیٹھے سیاسی دوستوں سے انہوں نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی اب ان کے یہ سیاسی دوست تسلیم کرتے ہیں کہ انہیں حامد میر کے خدشات کا پہلے سے علم تھا۔ حامد میر اور ان کے خاندان کا آئی ایس آئی اور اس کے چیف پر الزام لگانا موجودہ دور میں اداروں کے درمیان چپقلش کی وجہ سمجھنے میں آسانی فراہم کرتا ہے۔ حامد کے ادارے نے جس طرح ان کے اس الزام پر ان کا ساتھ دیا ہے وہ بھی کئی مفروضوں کو سچ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے

۔جیو کے صدر نے فوج کے بارے میں مقدس گائے کا لفظ استعمال کیا ہے اور جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ موجودہ حالات میں کسی طور بھی پاکستان کے حق میں بہتر نہیں ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ بھارتی ذرائع ابلاغ نے جس طرح ان کا ساتھ دیا ہے وہ بھی معاملات کو سمجھنے میں مدد دینے کے لیے کافی ہے۔کہا جاتا ہے کہ اگر کسی بھی قوم کو شکست دینی ہو تو اس قوم کے ذہنوں میں اس کی فوج کے خلاف نفرت بھر دو بھارت اسی منصوبے پر عمل پیرا ہے۔ایسے میں پاکستانی عوام کی یہ بھاری ذمہ داری ہے کہ وہ حالات پر گہری نظر رکھیں اور ملک میں تیزی سے رونما ہوتی ہوئی تبدیلیوں کو سمجھنے کی کوشش کریں اور کسی بھی صورت اپنے آپ کو ان معاملات سے الگ نہ کریں۔ملک میں اس وقت بھارت نواز قوتیں کافی سرگرم ہیں اور دیگر بیرونی ملک دشمن طاقتیں بھی پاکستان کو کمزور کرنے کے درپے ہیں ان قوتوں کو ملک کے اندر بھی کچھ لوگوں کی حمایت حاصل ہے ان میں سے کچھ دانستہ اور کچھ غیر دانستہ طور پر ان قوتوں کے عزائم کو تقویت دیتے ہیں پاکستان کے حالات پر نظر رکھنے والے یہاں مئی اور جون میں بڑی تبدیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں آئی ایم ایف نے بھی کچھ ایسا عندیہ دے رکھا ہے ۔طاہر القادری پھر سے متحرک ہونے جا رہے ہیں جمہوریت کی بساط لپیٹنے کے لیے انہیں بھی کچھ قوتوں کا تعاون درکار ہو سکتا ہے۔طالبان کے خلاف فیصلہ کن کاروائی کے لیے اب فوج بے چین ہے شاہد وہ اس معاملے کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہتی ہے مگر حکومت مذاکرات کے ذریعے ان کو قومی دھارے میں شامل کرنا

چاہتی ہے اور وہ کئی دوستوں کے ساتھ زبانی وعدوں کی پابند بھی ہے۔ بلوچستان میں بڑھتی ہوئی غیر ملکی مداخلت بھی پریشان کن ہے یہ معاملہ ہے کہ قابو میں نہیں آ رہا ہے ۔اب جبکہ ملک میں جمہوریت ہے اور تمام ادارے اپنے اپنے وقار اور خود مختاری کے لیے متفکر ہیں حکومت سے بھی کچھ اداروں کے تحفظات ہیں ایسے میں سب سے بڑے ادارے پارلیمنٹ کا کردار اہمیت اختیار کر گیا ہے یہ بات طے ہے کہ ملک کے تمام ادارے پارلیمنٹ کے زیر اثر ہیں اور پارلیمنٹ مزید آئینی ترامیم کر کے اداروں کو اپنے ماتحت کر سکتی ہے یہی عوامی حاکمیت کا اصلی تصور ہے۔ موجودہ حالات کے پیش نظر قومی اسمبلی اور سینٹ کو اپنا اجلاس روزانہ کی بنیاد پر منعقد کرنا چاہیے اور تمام امور کی خود نگرانی کرنا چاہیے ۔اس پارلیمان کو سب سے پہلے اپنے اندر سے اگر کوئی بھارت نواز لوگ ہیں تو ان کو الگ کرنا ہو گا پھر ملک میں ان عناصر کی نشاندہی کرنا ہو گی جو غیر ملکی قوتوں کے ایجنڈے کی تکمیل میں سرگرم ہیں ۔اداروں کے لیے نئے قوائد و ضوابط بنانے ہوں گے سب کو اپنی حدود کے اندر رہ کر کام کرنے کا پابند بنانا ہو گا۔ موجودہ حالات میں اگر کسی ادارے کو دوسرے کے متعلق کچھ تحفظات ہیں تو اسے پارلیمنٹ کی طرف رجوع کرنے کا پابند بنانا ہو گا نہ کہ وہ خود کوئی مہم شروع کر دے ۔اس سب عمل میں میڈیا کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے اگر وہ بھی کسی سازش کو شکار ہو جائے تو پھر پاکستانی عوام کی رہنمائی کون کرے گا لہٰذا پاکستانی میڈیا کو چاہیے کہ وہ اب انتہائی ذمہ

داری کا ثبوت دے محض اپنی برادری کی بنیاد پر کوئی مہم نہ چلائے بلکہ حالات کا درست ادراک کرے اور فریق بننے کی بجائے رہنماء بنے۔ میڈیا بھی اپنے اندر سے بھارت نواز لوگوں سے چھٹکارا پائے کیونکہ پارلیمنٹ اور میڈیا ہی اس ملک کو مل کر مسائل کی دلدل سے نکال سکتے ہیں۔

بدعنوانی ہی پاکستان کے زوال کا سبب ہے

قائدِاعظم محمد علی جناح جب برصغیر کے مسلمانوں کے ساتھ مل کر ان کے لیے ایک الگ ملک حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے تو ان کے پیشِ نظر سوائے ایک فلاحی ریاست کے قیام کے اور کوئی مقصد نہ تھا۔ وہ ایک ایسی ریاست بنانا چاہتے تھے جو باقی دنیا کے لیے بھی مثالی ہو اور ایسا اسی وقت ممکن ہو سکتا تھا جب نئی بننے والی ریاست بدعنوانی سے پاک ہو۔

اگر ہم آج کے پاکستان کو دیکھیں تو یہ بخوبی کہا جا سکتا ہے کہ یہ قائدِاعظم کے تصور سے ہزاروں کوس دور ہے۔ موجودہ پاکستان میں بدعنوانی اپنے عروج پہ ہے اور یہی بدعنوانی پاکستان میں تمام مسائل کی جڑ ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ آج ہمارا معاشرہ بدعنوانی کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے؟ ایک تو ہم اپنے قائد کی تعلیمات سے دور ہیں اور دوسرا ہم یہ سمجھ ہی نہیں پائے کہ بدعنوانی کسے کہتے ہیں اور ایسی روایات ہم نے اختیار کر لی ہیں جو بدعنوانی کے زمرے میں آتی ہیں۔ جب ہم اپنے قانونی حق سے تجاوز کرتے ہیں تو اسے ہی بدعنوانی کہا جاتا ہے سادہ لفظوں میں اسے یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ جس چیز پر ہمارا حق نہ ہو اسے ہم حاصل کر لیں یا اس پر قبضہ کر کے مفاد حاصل کرنا

شروع کر دیں۔ذرا غور فرمایئے کہ جو شخص سڑک پر دوسروں کا راستہ روک کر ٹھیہ لگاتا ہے اور شام کو فخر سے یہ بھی کہتا ہے کہ اس نے اپنے بچوں کے لیے رزق حلال کمایا ہے تو کیا ایسا شخص درست ہے ہر گز نہیں اسی طرح دھاندلی کے ذریعے اقتدار میں آنے والے لوگ اگر یہ کہیں کہ وہ ملک کی خدمت کریں گے تو ان کا یہ فرمانا بالکل غلط ہے بد عنوان لوگوں کے اقدامات بھی بد عنوانی کے ہی مرتکب ہوں گے ہمارے ہاں حکمران ملکی اور بین الاقوامی مقتدرہ کی حمایت سے ہی اقتدار میں آتے ہیں انہیں کبھی بھی عوامی پزیرائی نصیب نہیں ہوئی یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام تر توجہ کرپشن اور لوٹ مار پر ہی مرکوز ہوتی ہے۔2013کے ٹرانسپریسی انٹرنیشنل کے جائزے کے مطابق پاکستان کرپشن کے میدان میں شرم ناک حد تک باقی مہذب ملکوں سے بہت آگے ہے یہ پاکستان کے 175 میں سے 127 پوائنٹس corruption perceptions index ہیں جو پاکستان کے لیے انتہائی سبکی کا باعث ہے۔اس سروے میں صرف مالیاتی بد عنوانی کا ذکر ہے انتظامی ، معاشرتی اور اخلاقی بد عنوانی کو زیر بحث نہیں لایا گیا۔اگر ہم مجموعی طور پر پاکستان کے حالات کا جائزہ لیں تو ہم اسے ایک زوال پزیر معاشرہ ہی قرار دے سکتے ہیں۔

جب قوم اپنے اہداف سے دور ہو جاے، مقصد کو بھول جائے اور اپنے قائد کی تعلیمات کو بھلا دے تو زوال اس کا مقدر بن جایا کرتا ہے آج

انقلاب، آزادی، تبدیلی، حقیقی جمہوریت، پارلیمنٹ کی بالا دستی اور نئے پاکستان کی صدائیں تو بہت بلند ہو رہی ہیں مگر کبھی کسی نے قائد کی آواز پر بھی کان دھرا ہے آج بھی ان کی نحیف آواز میں ان کے اقوال ہماری فضاؤں میں تیر رہے ہے مگر سننے والے کان متوجہ نہیں ہو پا رہے ہیں اگر ہم نے آج بد عنوانی کی دلدل سے نکلنا ہے تو قائد کے الفاظ کو پلے باندھنا ہو گا اور ان کے کردار سے سیکھنا ہو گا۔ آپ انتہائی دیانت دار اور قانون کے تابع شخص تھے آپ کے تمام جدو جہد قانون اور اخلاق کے دائرے کے اندر رہی۔ قیام پاکستان کے بعد بطور گورنر جنرل آپ کا کردار اپنے اس تصور کے عین مطابق تھا جو آپ نے بد عنوانی سے پاک ایک ملک کے قیام کے لیے دیا تھا۔ گورنر جنرل کے دفتر میں ایک آسامی خالی تھی قائد اعظم خود ہی نوجوانوں سے انٹرویو لے رہے تھے اسی دوران آپ ایک نوجوان کی باتوں اور صلاحیتوں سے کافی متاثر ہوئے اور اسے منتخب کر لیا جب وہ جوان جانے لگا تو اس کی فائل میں موجود کاغذوں میں لگی ایک پن گر گئی نوجوان نے اسے دیکھا اور معمولی سمجھ کر نہ اٹھایا اور دفتر سے نکل گیا قائد نے اپنے سٹاف کو اس نوجوان کی تقرری منسوخ کر دینے کا کہا انہوں نے وجہ پوچھی تو قائد نے کہا جو شخص ایک پن کی اہمیت نہ جان سکا ہو اور اس کی حفاظت نہ کر سکتا ہو تو وہ کس طرح ملکی پیسے اور مفادات کی حفاظت کر سکے گا۔ قائد اعظم اس قدر باریک بینی سے سوچتے اور فیصلے کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان پر نہ ہی کوئی آج تک مالی بد عنوانی کو الزام لگا سکا اور نہ ہی کوئی

انتظامی و اخلاقی بد عنوانی کا الزام لگا سکا ہے آپ کے صاف اور شفاف کردار کی گواہی آپ کے دشمن بھی دیتے رہے ہیں۔لندن میں گول میز کانفرنس کے اختتام پر.برطانوی وزیر اعظم نے قائداعظم سے کہا کہ ہم ہندوستان میں جمہوریت نافذ کرنا چاہتے ہیں اور وہاں کے لوگوں کو با اختیار بنانا چاہتے ہیں لہٰذا ہم آپ کو وہاں صوبے کا گورنر بنانا چاہتے ہیں قائد نے اس کو جواب انتہائی غصے سے دیا اور کہا ،کیا آپ نہیں جانتے کہ ہم ایک آزاد ملک کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور آپ مجھے گورنر شپ کی رشوت دینا چاہتے ہیں آپ کو بطور وزیر اعظم ایسی حرکت سے اجتناب کرنا چاہیے تھا۔میں کسی بھی قسم کی کرپشن کو نا پسند کرتا ہوں اور مہذب دنیا میں یہ ایک قابل نفرت فعل ہے۔قائد کے اس دو ٹوک جواب سے سلطنت.برطانیہ کو یقین ہو گیا تھا کہ اب کوئی بھی پاکستان کو بننے سے نہیں روک سکتا ہے وہاں پر موجود کانگریسی رہنماؤں نے بھی.برطانیہ کے وزیر اعظم کو باور کروایا کہ جناح کو نہ ہی خریدا جا سکتا ہے اور نہ ہی غیر قانونی اور غیر اخلاقی رویوں سے متاثر کیا جا سکتا ہے۔جی الانہ نے اپنی کتاب دی لیبریٹر (the librater) میں قائد سے متعلق لکھا ہے کہ وہ رشوت، جھوٹ،اقربا پروری، سفارش اور ہر طرح کی بد عنوانی کو ناپسند کرتے تھے انہوں نے جا بجا اپنی تقریروں میں بھی اس کی مذمت کی ہے

-

قائد کا مقصد صرف اور صرف پاکستان کو ایک فلاحی ریاست بنانے کے سوا کچھ بھی

نہ تھا وہ ایک ایسا پاکستان چاہتے تھے جہاں قانون کی بالادستی اور عملداری ہو شفافیت یقینی ہو اور کرپشن کا نام ونشان تک نہ ہو۔آج پاکستان کے عوام کو یہ دیکھنا ہوگا کہ کونسا لیڈر قائد کی تعلیمات پر عمل کر رہا ہے اور کون اس سے دور ہے۔ہمیں ہر طرح کی بد عنوانی سے خود بھی نجات حاصل کرنا ہو گی اور بد عنوان قیادت اور لیڈر شپ سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا اسی میں پاکستان کی بقاء اور آنے والی نسلوں کی خوشحالی ہے

-

پاکستانی ایک بہادر قوم

دنیا کی ہر قوم کی ایک تاریخ ہے اس کا کردار اور اس کے خواص ہیں۔ کوئی بھی قوم اپنے مخصوص حالات میں ایک منفرد اور نمایاں کردار ادا کرتی ہے کسی بھی قوم کے بدلتے ہوئے حالات میں اس کے افعال تاریخ میں اس کا ایک مقام بنا دیتے ہیں جب بھی کسی قوم پر سخت اور مشکل وقت آتا ہے تو اس کی صلاحیتیں اور حوصلے نکھر کر سامنے آتے ہیں۔ بہادر، دلیر اور زندہ قومیں مشکل اور نا مسائد حالات میں نہ صرف اپنے وجود کو قائم رکھتی ہیں بلکہ ایسے حالات پر قابو پا کر اپنی آنے والی نسلوں کے لیے تاریخ میں ایک بلند مقام چھوڑ جاتی ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ ہر قوم کو اپنی روایات اور اپنے کردار پر فخر ہوتا ہے مگر وقت کا مورخ صرف اسی قوم کو باقی اقوام سے ممتاز اور منفرد تحریر کرتا ہے جو پے پناہ صلاحیتوں اور خوبیوں کی مالک ہو اور یہ امر طے ہے کہ تاریخ میں صرف بہادر اور دلیر قوموں کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے۔ بہادری دلیری اور ہمت جس قوم کا خاصہ ہو اسے دنیا کی نہ تو کوئی طاقت شکست دے سکتی ہے اور نہ ہی تاریخ اپنے اوراق میں سے اسے مٹا سکتی ہے۔ پاکستانی قوم بلاشبہ ایک ایسی ہی قوم ہے جو 1947 سے لے کر آج تک نامسائد حالات، امتحانوں اور آزمائشوں کا مردانہ وار مقابلہ کر رہی ہے۔ اس کی تاریخ بھی بڑی المناک ہے اسے دشمنوں نے اپنے حربوں میں مصروف رکھا ہی ہے

مگر اپنوں نے بھی اسے خوب زخم دیے ہیں قائدِاعظم کے بعد اسے ایک مخلص اور بہادر رہنماء کی ضرورت تھی مگر قیادت کے روپ میں مصلحت کے شکار مفاد پرست اقتدار کے پجاری حکمران اس کا مقدر ٹھرے۔ناقص منصوبہ بندی، حکمت عملی کے فقدان ،بدعنوانی اور اقربا پروری کی بدولت ان لوگوں نے اس قوم کو خوب دھوکا دیے رکھا۔اس قوم نے جمہوریت اور آمریت کے دوپاٹوں میں پسنے کے باوجود اپنے تشخص کو برقرار رکھا ہوا تھا کہ دہشت گردی کے ہولناک طوفان نے اسے آلیا۔گزشتہ کم وبیش پندرہ سالوں سے یہ قوم دہشت گردی کا سینہ تان کا مقابلہ کر رہی ہے حکمرانوں اور اداروں کی نااہلی اور بزدلی کی بدولت اسے اس جنگ کی قیمت کئی گنا زیادہ چکانا پڑ رہی ہے دہشت گردی کا عذاب جب سے اس قوم پر مسلط کیا گیا ہے اس وقت سے ہی ایک منظم سازش کے تحت اس کے نظریات کو بھی تباہ کیا جانے لگا ہے۔ملک کے اندر اغیار کے لے پالکوں کی ایک ایسی فوج بھی موجود ہے جو دہشت گردوں کے لیے ایک نرم گوشہ رکھتی ہے ان کے پالتوں مختلف حکومتی ، نجی اور ذرائع ابلاغ کے اداروں میں بیٹھ کر ان دہشت گردوں کے لیے نرم اور ہمدردانہ رائے عامہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔پوری قوم اس بات پر متفق رہی ہے کہ دہشت گردوں کے خلاف سختی سے نمٹا جائے مگر ان طالبانی مفکروں نے مذاکرات اور افہام و تفہیم کا راگ الاپنا شروع کر دیا اور قوم کو نظریاتی طور پر تقسیم کرنے کی کوشش کی ملک میں جو لوگ طالبان کے حمایتی ہیں ان کو اب اپنے ارادوں سے باز آجانا چاہیے اور کچھ سادہ لوح

لوگوں کو بھی اپنے نظریے اور سوچ پر نظر ثانی کرنی چاہیے جو نا سمجھی میں ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ سانحہ پشاور کے بعد آنے والے ایک مخصوص رد عمل نے مولانا فضل الرحمان، سمیع الحق، مولوی عزیز، منور حسن، مولانا لدھیانوی، مولوی اسحاق، حمید گل، اوریا مقبول جان، انصار عباسی اور ان جیسے کئی ایک کے اصل چہرے بے نقاب کر کے رکھ دیے ہیں۔ جماعت اسلامی کے منور حسن قتال کے دلدادہ اور سراج الحق مذاکرات کے علمبردار بنے پھرتے ہیں اور وہ ظالموں سے بھی محبت کا دم بھرتے ہیں اور مظلوموں کو بھی صبر کی تلقین کرتے ہوئے مصلحت سے کام لینے کا کہتے ہیں اسامہ کو شہید مانتے ہیں اور وطن کی خاطر جان دینے والوں کی شہادت پر سوال اٹھاتے ہیں کیا نظریہ مودودیت یہی ہے اگر ایسا ہے تو ان سب کی منافقت کو ان معصوموں کی قربانی نے بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے 16 دسمبر کے پشاور کے سانحے نے ان کے تمام عزائم کو خاک میں ملا دیا اس المناک دہشت گردی کے واقعے نے پوری قوم کو ایک نیا جذبہ یگانگت عطا کیا ہے پوری قوم نے جس طرح اس کاروائی کے خلاف ردِ عمل دیا ہے اس نے اس قوم کے بہادر اور دلیر ہونے پر مہر ثبت کر دی ہے۔ معصوم شہدوں کے والدین نے جس عزم اور حوصلے سے اس صدمے کو برداشت کیا ہے اس کی مثال انسانی تاریخ میں مشکل سے ہی ملے گی خاصانِ خدا کا یہی طرزِ عمل ہوا کرتا ہے ایک شخص جس کا اکلوتا بیٹا اس حادثے میں شہید ہوا یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ اسے اپنے بیٹے کی شہادت پر فخر ہے ۔وہ ٹیلی وژن پر بتا رہا تھا کہ اس کا معصوم بیٹا بڑے ہو کر

فوج میں بھرتی ہونے کا خواہش مند تھا اور وہ اپنے ملک کے لیے کچھ کر گزرنے کو بیتاب تھا اس شخص نے بڑے حوصلے سے بتایا کہ جو لاش اس نے اٹھارہ سال بعد اٹھانی تھی وہ آج اٹھائی ہے اس کے شہید بیٹے نے اسے بہت جلد قوم کے سامنے سرخرو کر دیا ہے وہ اپنے بیٹے کا شکریہ ادا کر رہا تھا دوسری طرف جب آرمی چیف زخمی بچوں کی عیادت کے لیے گئے تو ایک زخمی بچے نے ان سے کہا کہ انکل ہم پر عزم ہیں اور ہمیں دہشت گردی کے خلاف اس جنگ کا ایک سپاہی سمجھیں جس قوم کے بچے اپنے سپہ سالار کو حوصلہ دیتے اور ہمت بندھاتے ہوئے نظر آئیں اس قوم کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی ہے یہ قوم بیرونی دشمنوں سے جنگ جیت چکی ہے اب اس نے اندرونی دشمن پر بھی کاری ضرب لگائی ہے۔اس نے جس ہمت ،طاقت، بہادری، شجاعت اور دلیری سے ان مشکل ترین حالات کا مقابلہ کیا ہے اس کی کوئی مثال دینا آج کے دور میں ناممکن ہے بلا شبہ پاکستانی قوم کو تاریخ میں ایک بہادر اور دلیر قوم کے طور پر تادم قیامت یاد رکھا جائے گا۔

ادارہ جاتی سوچ کا تسلط

پاکستان میں گزشتہ 14 سالوں میں دہشت گردی کے بڑے اور المناک حادثات رونما ہوئے ہیں ان حادثات میں مرنے والے افراد کی تعداد اب ہزاروں میں ہے۔ہمارے ہاں اب ایسے حادثات تسلسل سے ہو رہے ہیں۔ دہشت گردی کے ان واقعات نے قوم کے مزاج پر بھی اثر ڈالا ہے جن واقعات میں مرنے والوں کی تعداد درجنوں میں ہو قوم اس کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیتی ہے اور حکومت بھی ایسے واقعات پر واجبی سے بیانات دینے پر ہی اکتفا کرتی ہے ہاں البتہ جس کسی سانحے میں مرنے والوں کی تعداد سو سے تجاوز کر جائے تو ردعمل بڑا پُر جوش انداز میں سامنے آتا ہے۔ماضی قریب میں کراچی ،لاہور اور پشاور میں عاشور، چہلم اور چرچ پر حملوں نے قوم میں بھرپور ارتعاش پیدا کیا حکومت بھی کچھ روز متحرک رہی پھر وہی خاموشی اور عمومی طرزِ حکمرانی وزندگی چلتا رہا۔اگر ہم اپنے اوپر ہونے والے پہلے خودکُش بم دھماکے کے بعد سنجیدگی اور دیانت داری کا مظاہرہ کرتے اور ملک میں شروع ہونے والی دہشت گردی کی خطرناک لہر کا ادراک کر لیتے تو حالیہ پشاور کا 12/16 کا واقعہ پیش نہ آتا۔ بدقسمتی سے حکمرانوں کے ساتھ ساتھ قوم بھی حالات سے نظریں چرانے کی عادی ہو چکی ہے ہم صرف مخصوص اداروں کی پیدا کردہ سوچ پر ہی متحرک ہوتے ہیں اور پاکستان میں مضبوط ادارہ جاتی سوچ کے تحت ہی اپنی

رائے قائم کرتے ہیں اب ملک کی سول حکومت بھی ان اداروں کے اشاروں پر چلتی ہے بلا شبہ مقننہ ہی بااختیار ادارہ ہے مگر دیگر طاقتور ادارے اسے اپنی خواہشات کے مطابق پالیسی بنانے کا کہتے ہیں ایسے اداروں کے لوگ ہی ذرائع ابلاغ میں موجود ہیں اور وہ ان کی منشا کے مطابق رائے عامہ تشکیل دیتے ہیں۔ پشاور کے سانحے کے بعد پاکستانی قوم کو موجودہ حالات کو بڑے دقیق انداز میں سمجھنا ہوگا حکمرانوں اور اداروں کے درمیان طاقت کے حصول کی کشمکش کو جانچنا ہوگا۔ ہم گزشتہ 14 سال سے ایک جنگ میں ہیں اور اب تک اس کے محرکات کو سمجھ نہیں پائے۔ ہمارے حکمران اور ادارے کیوں ناکامی کا شکار ہیں ؟اعلیٰ ذمہ داران فرماتے ہیں کہ نانبائی زیادہ روٹیاں لینے والوں پر نظر رکھے کیا خوب نصیحت فرمائی ہے اپنی کارکردگی صفر ہے اور دوسروں کو ہدایات جاری کر رہے ہیں ان اداروں اور ذمہ داران سے یہ سوال کیا جانا چاہیے کہ پشاور میں دہشت گرد 8 چیک پوسٹیں کس طرح عبور کرکے سکول میں داخل ہوے ہیں۔ قوم افسوس تو منا رہی ہے مگر کیا یہ سوال نہیں اٹھانا چاہیے کہ کس کی غفلت اور لاپروائی سے یہ سانحہ رونما ہوا۔ شمعیں روشن کرنے، ریلیاں نکالنے اور بیانات دینے سے جذبات کا اظہار تو کیا جا سکتا ہے مگر دہشت گردی پر قابو نہیں پایا جا سکتا ہے۔ گزشتہ آٹھ سال سے حکمران جعلی موبائل فون سمیں بند نہیں کرواسکے وہ طاقتور موبائل فون کمپنیوں اور ان کے کمیشنوں کے سامنے بے بس ہیں۔ جہاں طالبان نے اس سانحے کی ذمہ داری قبول کی ہے وہاں حکومت اور اس کے اداروں کو

بھی اپنی نااہلی اور نالائقی کی ذمہ داری قبول کرنی چاہئے ۔اتنے بڑے سانحے کے بعد کم از کم کچھ سول اور فوجی ذمہ داران کو مستعفی ہو جانا چاہئے تھا۔اس سانحے کے بعد فوری پھانسی دینے کے عمل پر سے پابندی اٹھائی گئی ہے جس کا مقصد قوم کے جذبات کو کم کرنا اور انہیں حقیقت حال سے دور رکھنا ہے بلاشبہ یہ ایک بڑا قدم ہے مگر ریاست کو ہر قسم کی دہشت گردی کے خلاف مزید سخت اقدامات کرنے ہوں گے ۔ قوم نے پشاور میں بچوں کی شہادت پر شدید ردِ عمل دیا ہے جو کہ درست قدم ہے مگر یہی قوم تھر 132 میں 150 بچوں کی ہلاکت پر کیوں خاموش ہے؟ یہ بچے بھوک اور غربت کی وجہ سے بیمار ہوئے اور ہسپتالوں میں سہولیات اور ادویات نہ ہونے کی وجہ سے مر گئے ان کی ناحق موت کا مقدمہ کون لڑے گا ؟ان کی موت کے ذمہ داران کے خلاف آپریشن کون کرے گا؟سرگودہا میں آٹھ بچے ہسپتال میں آکسیجن نہ ہونے سے مر گئے کون ان بچوں کی موت کا سوال اٹھائے گا؟آج ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستانی قوم اپنے حقیقی مسائل کو سمجھے۔ادارہ جاتی سوچ کی بجائے اپنی سوچ کو پروان چڑھائے اور تمام مسائل کا درست ادراک کرے ۔اپنے حکمرانوں کی ہر قسم کی غفلت پر ان کے خلاف احتجاج کرے اور ان کا شدید احتساب کرے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ طالبان اور دہشت گرد اس ملک کے بدترین دشمن ہیں مگر ان دہشت گردوں کے لیے نرم گوشہ رکھنے والے بھی پاکستان کے خیر خواہ نہیں ہے اور اسی طرح وہ حکمران اور افسران جو دیگر قسم کی آفات اور اموات کے ذمہ دار ہیں وہ بھی پاکستان کے نہ صرف دشمن ہیں بلکہ

- اس ریاست کی سلامتی کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ ہیں

جمہوری مارشل لاء

جمہوریت ہی بہترین نظام حکومت ہے اور اگر یہ اپنے حقیقی روپ میں نافذ ہو تو اس کے اثرات اور ثمرات معاشرے پر مفید اور دیر پا مرتب ہوتے ہیں۔جب کہ دوسری جانب اگر جمہوری طرز حکومت میں بددیانتی اور نااہلی شامل ہو تو پھر معاشرے میں جو تعفن پھیلتا ہے اس سے نجات پانا بھی مشکل ہو جایا کرتا ہے اور معاشرے کو جو قیمت اس کی چکانا پڑتی ہے اس کا اندازہ صرف پاکستانی قوم ہی کر سکتی ہے۔بدقسمتی سے پاکستانی قوم ایسے ہی تجربات سے گزرتی رہتی ہے اس قوم نے شروع ہی سے کبھی جمہوریت اور کبھی آمریت کے ثمرات کو چکھا ہے۔اس نے اپنا سفر ہمیشہ سے دو مختلف سمتوں میں طے کیا ہے یہی وجہ ہے یہ قوم 1947 سے لے کر اب تک اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکی ہے اور اس کی منزل قریب قریب مستقبل میں بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہے۔قیام پاکستان کے وقت اس قوم نے اپنے لیے جمہوری طرز حکومت ہی مختص کیا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پر آمریت بھی مسلط کی جاتی رہی ہے اور یوں یہ قوم آمریت اور ناقص جمہوریت کے دو پاٹوں میں پستی رہی۔عمومی طور پر اب عام پاکستانی جمہوریت سے کچھ زیادہ خوش نظر نہیں آتا ہے آخر اس کی وجہ کیا ہے ؟ایک بہترین طرز حکومت پاکستان میں مقبول کیوں نہیں ہو سکا ہے اور اس کے ثمرات عوام تک کیوں نہیں پہنچ پائے ہیں ؟اس کا جواب آسان الفاظ میں

یوں بھی دیا جاتا ہے کہ یہاں آمریت نے اسے کبھی پھلنے پھولنے نہیں دیا ہے یہ درست ضرور ہے مگر مکمل جواب ہر گز نہیں ہے درحقیقت یہاں جمہوریت کے علمبردار ہی غدار رہے ہیں سیاستدانوں کی نااہلی اور نالائقی نے بھی قوم کو مایوس کیا ہے ماضی کے قصے کو جانے دیں اگر ہم حال کی بات کریں تو سیاستدانوں کا رویہ آج بھی کافی مایوس کن اور ان کی کارکردگی شرمناک حد تک خراب ہے اب بظاہر ملک میں مکمل جمہوری نظام رائج ہے اور قانون کی عملداری ہے تو پھر یہاں حکومتی معاملات چلانے میں فوج کا اتنا اثر رسوخ کیوں ہے۔ کرپشن اور بد عنوانی کے دلداہ حکمرانوں اور سیاستدانوں نے اُس فوج کو اپنے نظام میں گھسنے کی دعوت دی ہے جس نے ہمیشہ ان کے نظام پر شب خون مارا اور ملک میں آمریت کی سیاہ چادر کو ان پر تانے رکھا۔ان جمہوریت کے ٹھیکیداروں نے ہمیشہ فوج سے ہی گلہ کیا کہ اس نے انہیں مکمل آزادی سے حکومت کرنے اور نظام کو چلانے نہیں دیا مگر آج یہ سب انکے اپنے نظام میں داخل ہونے پر خوش ہیں اور اسے وقت کی ضرورت قرار دے رہے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ فوج نے ہی لڑنی ہے مگر حکمت عملی تیار کرنا قوم کا مورال بلند کرنا اور عالمی سطح پر رابطے کرنا سول حکومت کے فرائض میں ہی، شامل ہے مگر موجودہ سول حکومت اپنے ان فرائض کو ادا کرنے میں کلی طور ناکام ہوئی ہے سیاستدانوں کے کام نہ کرنے سے جو خلا بنے گا اسے فوج نے ہی بھرنا ہے لہٰذا ملک میں بڑھتا ہوا فوج کا اثر رسوخ ایک فطری عمل معلوم ہونے لگا ہے۔سول

اداروں کی ناکامی کے بعد فوج نے ان کے امور بھی خود سرانجام دینے شروع کر دیے ہیں ۔ پاکستان میں موجودہ اکیسویں صدی میں اکیسویں ترمیم کوئی حیرت کی بات نہیں ہے جہاں پارلیمنٹ فرد واحد یعنی آرمی چیف کی خواہشات کو من و عن قانون کا درجہ دے دے۔ارکان پارلیمنٹ کو اس پر بحث کی اجازت بھی نہ ہو۔اس طرح سے فوجی عدالتوں کو قیام نہ صرف ہمارے عدالتی نظام بلکہ ہمارے پارلیمانی نظام پر بھی ایک بڑا سوال ہے۔امریکی وزیر خارجہ ، ایساف کمانڈر اور افغان صدر سمیت باہر سے آنے والے رہنما جی ایچ کیو ہی جانا پسند کرتے ہیں جبکہ اسلام آباد میں قائم وزیر اعظم ہاؤس بھوت بنگلے کا منظر پیش کر رہا ہے جناب وزیر اعظم کو ملک کی کوئی فکر ہی نہیں ہے انہیں پوری دنیا میں صرف دو ہی دوست نظر آتے ہیں بھارت سے ان کی محبت کا اندازہ تو سب کو ہی ہے اور سعودی عرب کے ان پر احسانات کا بوجھ سب جانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ سعودی حکمران کی عیادت کے لیے وہاں چلے گئے ہیں جبکہ آرمی چیف برطانیہ کے دورے پر ہیں وہاں وہ حزب التحریر کے خلاف اقدامات کرنے پر اس پر زور دے رہے ہیں الغرض تمام امور مملکت فوج کو ہی انجام دینے پڑ رہے ہیں حتیٰ کہ قوم کے مورال کو بلند رکھنے کے لیے گیت و نغمے بھی آئی ایس پی آر پیش کر رہی ہے نظریہ ضرورت کو ہمیشہ کے لیے دفن کرنے والے آج کیوں خاموش ہیں؟ کسی بھی طالع آزما کا روکنے والے اس کے لیے دروازے کیوں کھول رہے ہیں ؟ کبھی آمریت اور کبھی جمہوریت کی باری کے بعد اس بار ملک میں دونوں قوتوں نے مل کر جمہوری

مارشل لاء نافذ کر دیا ہے اور یوں آرٹیکل 6 کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا ہے۔

پکوان تیار ہونے کو ہے

سابق صدر و آرمی چیف جنرل مشرف ایک بار پھر سیاست میں سرگرم ہوتے دیکھائی دے رہے ہیں۔ وہ آج کل مختلف روایتی سیاستدانوں سے ملاقاتیں کر رہے ہیں عمومی طور پر خیال کیا جا رہا ہے کہ وہ مستقبل قریب میں کوئی اہم سیاسی کردار ادا کرنے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف حکمرانوں کا خیال ہے کہ جنرل مشرف کا اب پاکستانی سیاست میں کوئی کردار باقی نہیں ہے قوم نے انھیں بھلا دیا ہے۔ موجودہ حکمران یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس حوالے سے خوش نصیب ہیں کہ انہیں مضبوط سیاسی اپوزیشن کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا ہے درحقیقت یہی بات ان کی تباہی کا سبب بنتی جا رہی ہے اور وہ ہر قسم کا غیر آئینی کام تسلسل کے ساتھ کرتے جا رہے ہیں مثال کے طور پر حالیہ پٹرولیم مصنوعات پر لگایا جانے والا جنرل سیلز ٹیکس بھی غیر آئینی طریقے سے لگایا گیا ہے ایسا ٹیکس لگانے کے لیے پارلیمنٹ سے بِل کے ذریعے منظوری لینا لازمی ہے مگر حکومت نے ایسا کوئی فنانس بِل پارلیمنٹ سے منظور نہیں کروایا ہے اور موجودہ اپوزیشن نے اس پر کوئی ردِ عمل بھی نہیں دیا اور نہ ہی اسمبلی میں اس پر آواز اُٹھائی ہے اس سے حکومت اور اپوزیشن کی ملی بھگت کا علم بخوبی ہوتا ہے۔ قومی سلامتی کے مسلے پر سیاسی حکومت پہلے ہی تمام تر معاملات سے باہر ہے اور فوج نے اس سے متعلق تمام امور اپنے ذمہ لے رکھے ہیں

اکیسویں ترمیم کو جس طرح مقتدرہ کی خواہش پر عجلت اور جلد بازی میں منظور کروایا گیا وہ سب کے سامنے ہیں۔ ملکی معاملات میں فوج کا بڑھتا ہوا اثر رسوخ اب کسی سے پوشیدہ نہیں رہا ہے۔ وزیر اعظم بھی اس تاثر کو زائل کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہوئے ہیں کہ خارجہ اور دفاعی پالیسی پارلیمنٹ کی بجائے کسی اور جگہ بنتی اور پھر نافذ ہوتی ہے۔ 6 فروری کو راحیل شریف نے وزیر اعظم سے ملاقات میں پولیس، انٹیلیجنس اور سول اداروں کے اہلکاروں کی نااہلی کی شکایت کی ہے اور ان کی استعداد کار کو بڑھانے کا کہا ہے۔ دفاع، خارجہ اور قومی سلامتی کے امور سے آگے نکل کر فوج اب دیگر شعبوں میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانا چاہ رہی ہے گذشتہ دنوں ایک بیان میں کہا گیا کہ ہم ہاکی کے کھیل میں کھویا ہو مقام قوم کو دوبارہ دلوائیں گے۔ درست جب ملک کے سول ادارے کرپشن کی دلدل میں دھنس چکے ہوں اور بد دیانتی و نااہلی اپنی آخری حدوں کو چھو رہی ہو تو کسی نے یہ کام کرنے ہیں۔ ہمارے سیاستدانوں کا مقصد حیات صرف اپنی دولت میں اضافے تک محدود ہو چکا ہے وہ اس سے آگے سوچنے سے قاصر ہیں۔ قوم کی تربیت، اس کے مستقبل کے لیے لائحہ عمل اور حکمت عملی ترتیب دینے کے لیے ان کے پاس نہ ہی کوئی سوچ ہے اور نہ ہی کوئی پروگرام ہے۔ پارلیمنٹ کسی بھی مسلے پر بحث کرتی ہے مسائل کا ہر طرح سے جائزہ لیتی ہے ان کے تمام پہلوؤں کو مدِ نظر رکھ کر واضح قانون سازی کرتی ہے ایک ایک لفظ کی تعریف کی جاتی ہے اور تمام ابہام کو ختم کیا جاتا ہے مگر افسوس سے کہنا

پڑتا ہے کہ ہماری پارلیمنٹ مکمل طور پر بے اثر ہو کر رہ گئی ہے۔ کور کمانڈر کانفرنس میں اس بات کا عزم کیا گیا کہ ملک سے انتہا پسندی۔ دہشت گردی اور فرقہ واریت کا مکمل خاتمہ کیا جائے گا۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری پارلیمنٹ ان تینوں الفاظ کا از سر نو جائزہ لے ان کی نئی تعریف وضع کرے۔ قوم کو بتائے کہ انتہا پسندی، دہشت گردی اور فرقہ واریت کسے کہا جاتا ہے۔ اب فرقہ واریت کے نام پر لوگوں کی مذہبی آزادی کو غصب کیا جا رہا ہے۔ آزادی رائے پر قدغنیں لگ رہی ہیں اختلاف رائے کو انتہا پسندی کا نام دیا جانے لگا ہے۔ عجلت میں کتابوں پر پابندی لگائی گئی ہے حصول علم اور تحقیق کے کام پر قفل لگائے جا رہے ہیں۔ جمہوریت کا راگ الاپنے والوں کو اب یہ خبر ہو جانی چاہیے کہ ان کی اس گیت سنگیت کی محفل الٹنے کا وقت قریب ہے معاملات ان کے ہاتھ سے نکلتے جا رہے ہیں ملک میں ایک نئے نظام کی بنیاد رکھی جا چکی ہے اور بڑی صفائی کے ساتھ اس کی دیواریں بلند کی جا رہی ہیں اور اس کو خوبصورت بنانے کے لیے تمام تر نمائشی اشیاء کو اکٹھا کیا جا رہا ہے۔ نئی عمارت کے مکمل ہونے پر کھانے کی دعوت تو لازمی ہو گی چوہدری شجاعت نے اس پکوان کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو تیار ہونے کو ہے۔ مشرف ملک کے سنجیدہ اور روایتی سیاست دانوں سے رابطہ کر رہے ہیں۔ امین فہیم، پیر پگاڑہ، چوہدری شجاعت سمیت ایک بڑی تعداد ان سے رابطے میں ہے نئے نظام کے معماروں نے انہیں اشارے دے رکھے ہیں حکمران کہتے ہیں کوئی کھچڑی پک رہی ہے مگر چوہدری شجاعت نے نئے پکوان کی نوید سنائی ہے

جس کی خوشبو اب سب کو محسوس ہو رہی ہے۔

امریکی وزیر دفاع کا دورہ افغانستان

امریکہ کے نئے وزیر دفاع ایش کارٹر نے افغانستان کا دورہ کیا ہے۔ان کا یہ دورہ اچانک اور غیر اعلانیہ تھا۔بقول ان کے وہ افغانستان کی صورت حال جاننے کے لیے یہاں آئے ہیں۔امریکہ کا افغانستان میں فوجیں بھیجنے کا واحد مقصد یہاں قیام امن کو یقینی بنانا تھا اور یہاں پر موجود دہشت گردوں کو ختم کرنا تھا اس سے قبل امریکہ یہ دنیا کو باور کروا چکا تھا کہ افغانستان میں اس کا امن مشن مکمل ہو چکا ہے اور اب وہ اپنی فوجیں واپس بلا رہا ہے دسمبر 2014تک اس نے اپنی فوجوں کو واپس بلایا بھی ہے مگر ساتھ ہی افغانستان میں دہشت گردی کے واقعات میں تیزی بھی آئی ہے۔اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق افغانستان میں 2014کے دوران ہلاکتوں میں 22فیصد تک اضافہ ہوا ہے۔ایش کارٹر نے اب یہ عندیہ دیا ہے کہ امریکہ افغانستان میں اپنی فوجیں مزید کچھ عرصہ تک رکھنے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ امریکی فوج کے انخلاء پر نظر ثانی کے لیے تیار ہے۔امریکہ کے اب بھی دس ہزار فوجی افغانستان میں موجود ہیں اس کے ساتھ ساتھ افغان صدر اشرف غنی نے بھی امریکی وزیر دفاع کے اس خیال کی تائید کی ہے کہ امریکہ کو ابھی مزید کچھ عرصہ تک وہاں رہنا ہو گا۔انہوں نے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ امریکہ فوجیوں کے انخلاء کی رفتار کو سست بنائے۔امریکی وزیر دفاع کے

افغانستان کے دورے کے بعد یہ بات سچ معلوم ہو رہی ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی ابھی تک دہشت گردی کے خلاف جنگ مکمل طور پر جیت نہیں پائے ہیں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہشت گردوں کا نیٹ ورک ابھی باقی ہے کارٹر کے اس بیان کو جنگ میں امریکی ناکامی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور یہ پہلو انتہائی افسوس ناک ہو گا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ جس قدر طویل ہو گی خطے کے لوگ اسی قدر زیادہ تکلیفوں اور پریشانیوں کا شکار رہیں گے ہلاکتیں اور تباہی ان کے مقدر کا حصہ بنی رہے گی۔ آخر ان وجوہات کو تلاش کرنا ہو گا کہ جن کی بدولت امریکہ اور اس کے اتحادی اس جنگ میں ناکام ہوتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ چند دہشت گردوں نے عالمی طاقتوں کو لوہے کے چنے چبانے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں اقوام متحدہ کو ایک موثر کردار ادا کرنا ہو گا سلامتی کونسل افغانستان کے مسلے پر ایک ٹاسک فورس قائم کرے جو ان وجوہات کا پتہ لگائے جن کی بدولت اس خطے میں جنگ طول پکڑتی جا رہی ہے۔ کوئی بھی دہشت گرد گروپ بغیر کسی ریاستی تعاون کے اتنی طویل جنگ نہیں لڑ سکتا ہے یہی ٹاسک فورس افغانستان میں موجود لڑاکا گروپس کے بارے میں تحقیقات کرے کہ ان کے کن کن ممالک کے ساتھ روابط ہیں اور کون کون سی حکومتیں ان گروہوں کو مالی اور حربی تعاون پیش کر رہی ہیں۔ ایک غالب امکان یہ بھی موجود ہے کہ کچھ ممالک عالمی سیاست میں اپنا اثر رسوخ قائم رکھنے کے لیے اور اپنے مخصوص نظریات کے پرچار کے لیے ان دہشت گرد گرپوں کے

ذریعے دباؤ بڑھاتے ہیں۔ دنیا میں بڑھتا ہوا ادارہ جاتی اثر رسوخ بھی اس جنگ کو طول دینے میں مددگار ثابت ہو رہا ہے کیونکہ بعض ممالک میں معاملات سیاسی قیادت کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں اور اب وہاں فیصلے ادروں کے سربراہ کرنے لگے ہیں اداروں کے فیصلے اور پالیسیاں عوامی امنگوں اور ان کی فلاح کے برعکس ہوا کرتے ہیں لہٰذا سیاسی عالمی رہنماؤں کو بھی معاملات پر اپنی گرفت مظبوط رکھنا ہو گی۔ عالمی رہنماؤں میں ہی وہ لیڈر ہیں جو سب سے زیادہ متحرک ہیں مگر Angela Markel جرمنی کی چانسلر ان کا فوکس یوکرائین اور روس کے معاملات تک محدود ہے انہیں افغان ایشو کی طرف بھی متوجہ ہونا پڑے گا۔ کیونکہ پچھلی صدی میں عالمی سیاست میں جرمنی کا کردار بڑا بنیادی نوعیت کا تھا لہٰذا اسے اب بھی وہی کردار ادا کرنا ہو گا اور دنیا کی واحد سپر پاور کے کھیل کو سب کے سامنے آشکار کرنا پڑے گا۔ حال ہی میں پاکستان اور افغانستان ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے نظر آ رہے ہیں ان دونوں ممالک کے اب تعلقات مثالی بن رہے ہیں دہشت گردی کے خلاف ان کی مشترکہ کوششوں کے ثمرات بھی سامنے آنا شروع ہوا ہی چاہتے تھے کہ امریکہ نے خطے میں موجود رہنے کا اشارہ دے دیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس خطے میں امریکی موجودگی یہاں کے امن کے لیے تباہ کن تو ثابت نہیں ہو رہی ہے ؟ عالمی رہنماؤں کا اس طرف متوجہ ہونا اب لازمی ہو گیا ہے کیونکہ پوری دنیا کا امن افغانستان کے امن کے ساتھ ہی مشروط ہے۔

کمزور حکومتیں اور مضبوط غیر ریاستی عناصر

غیر ریاستی عناصر کے بڑھتے ہوئے اثر نے پوری انسانیت کا سکون برباد کر کے رکھ دیا ہے۔آج عالمی امن کو سب سے زیادہ خطرہ ان غیر ریاستی تنظیموں سے ہی لاحق ہے۔ریاست کے مقابلے میں ایسی تنظیمیں تیزی کے ساتھ پروان چڑھ رہی ہیں اور ان کی عوامی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔آخر اس بنیادی وجہ کو تلاش کرنا بھی ضروری ہے کہ جس کی بدولت دنیا میں حکومت اور ریاست کمزور ہوتی ہوئی نظر آ رہی ہے جبکہ دوسری طرف سیاست کے مقابلے میں اداہ جاتی سوچ اور غیر ریاستی عناصر مضبوط ہوتے ہوئے دیکھائی دے رہے ہیں۔گزشتہ صدی کی اختتامی دہائیوں کے دوران مختلف ممالک کے خفیہ اداروں نے معاملات پر اپنی گرفت مضبوط کرنا شروع کر دی تھی۔انہوں نے اپنے اپنے ملکوں میں سیاسی اور عوامی قیادتوں کو بے اثر اور کمزور کرنا شروع کر دیا تھا۔ان اداروں نے اپنی مرضی سے کھیل ترتیب دینے شروع کر دیے اور برتری قائم کرنے کے لیے قانونی اور اخلاقی حدوں کو پار کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔شاہ فیصل،ذولفقار علی بھٹو،ناصر جمال،کرنل قذافی،صدر صدام اور پھر حسنی مبارک گزشتہ صدی کے مقبول رہنماء تھے یہ افراد جتنا عرصہ منظر پر رہے ایجنسیوں کا عالمی سیاست میں کردار محدود تھا مگر ایک منظم طریقے کے ساتھ ان شخصیات کو عالمی منظر نامے سے الگ کر دیا گیا

اور مشرق وسطی اور جنوبی ایشیا میں اداہ جاتی تسلط مضبوطی کے ساتھ قائم ہوتا چلا گیا جبکہ دوسری جانب امریکہ اور یورپ میں ان اداروں نے بڑے منظم اور غیر محسوس انداز میں وہاں کے حکمرانوں کو نظام کے اندر رہتے ہوے اپنے زیر اثر کر لیا۔جب ریاست اور عوام کے درمیان تعلق کمزور ہونا شروع ہو جائے تو وہاں ایجنسیاں مضبوط اور پر اثر ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ خصوصاً ایشیا میں ریاست اور حکومت عوام کی توقعات پر پورا نہیں اتریں جس کی بدولت یہاں کے عوام نے اپنی اپنی حکومتوں کے خلاف تحریکوں کا آغاز کیا اور وہ کمزور ہونا شروع ہو گئیں۔دوسری طرف یورپ اور امریکہ میں انہی چیزوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا اور وہاں اپنا تسلط قائم کیا۔ادھر کے حکمران سوک ایشوز اور ویلفیر سوسائٹی کے قیام میں الجھے رہے اور عالمی سیاست سے دور ہوتے چلے گئے وہ مقامی اور عالمی معاملات کو چلانے میں توازن برقرار رکھنے میں ناکام رہے اور یوں وہاں بھی ادارہ جاتی تسلط قائم ہو گیا۔یہاں ایک بات اہم ہے کہ گزشتہ صدی میں افغان وار کے ساتھ ساتھ ایک طویل پراکسی وار بھی لڑی گئی مگر اس کے کمزور اور بے اثر ہونے پر ہی ہوا۔گویا یہ KGB کا اختتام ایک مضبوط خفیہ ایجنسی بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ عالمی اور علاقائی امن کو سب سے زیادہ نقصان ان ایجنسیوں نے ہی پہنچایا ہے۔ادارے اپنے مقاصد اور عزائم کی تکمیل کے لیے غیر ریاستی گروہ قائم کرتے ہیں کیونکہ ان کے مقاصد حکومت اور ریاست سے بالا بالا ہوتے ہیں لہٰذا وہ قوت اور طاقت کا حصول انہیں

غیر ریاستی گروپس سے حاصل کرتے ہیں ان گروہوں کو بنانے اور مضبوط کرنے میں انہیں اداروں کا کسی نہ کسی شکل میں ہاتھ ہوتا ہے۔طالبان ،القائدہ،بوکوحرام اورداعش جیسی تنظیمیں کسی نہ کسی طرح انہیں اداروں کی مرضی سے ہی معرضِ وجود میں آسکتی ہیں ۔ شام میں بشار الاسد کو حکومت سے الگ کرنے کے لیے امریکہ نے غیر ریاستی عناصر کو سہارا لیا اور شامی حکومت کو ختم کرنے کے لیے وہاں موجود باغیوں کی بھرپور مدد کی۔ 2012کے اپنے صدارتی انتخابات کے دوران ایک مباحثے میں اوباما نے کہا تھا کہ وہ بشارالاسد کو کسی صورت شام کا صدر نہیں رہنے دیں گے ان کے دن گنے جا چکے ہیں اور وہ جلد ہی اقتدار سے محروم ہو جائیں گے۔بقول ان کے شام ایران کے ساتھ مل کر حزب اللہ کی مدد کرتا ہے اور حزب اللہ امریکی دوست اسرائیل کے وجود کے لیے خطرہ بنا ہوا ہے۔ کوئی بھی ملک کسی دوسرے ملک کی حکومت کو کسی بھی عالمی قانون کے تحت ختم نہیں کر سکتا ہے مگر وہ ان غیر ریاستی گروہوں کی مدد لیتا ہے یہی گروپس اب عرب،مشرق وسطی اور جنوبی ایشیا میں امن کے دشمن بنے ہوئے ہیں ۔اس ضمن میں سعودی بادشاہ سلیمان نے ایک معقول تجویز دی ہے کہ تمام اسلامی ممالک دہشت گردی پر قابو پانے کے لیے ایک کمیٹی قائم کریں جو حکومتوں کے ساتھ مسلسل رابطے میں ہو اور قیادتیں خود براہ راست تسلسل کے ساتھ ان مسائل سے نبرد آزما ہونے کی کوشش شروع کریں ۔اس سے حکومتوں کے درمیان تعاون مضبوط ہو گا اور ایجنسیوں اور ان گروہوں کے درمیان رابطوں پر کاری ضرب بھی لگ سکے گی۔جب تک حکومتیں

ان اداروں کے اثر سے نہیں نکلیں گی اس وقت تک یہ دنیا غیر ریاستی اور ادارہ جاتی
تسلط کے زیر اثر بد امنی کا شکار رہے گی۔

اسلحہ کی تجارت اور اسلامی امہ

گزشتہ صدی میں روس کے ٹوٹنے پر خوشی کے شادیانے بجائے گئے تھے۔ عالمی ذرائع ابلاغ نے فتح کے ترانے گائے تھے۔ امریکہ اور روس کی سرد جنگ کے اختتام پر یہ تاثر بھرپور طور پر پیش کیا گیا تھا کہ اب دنیا میں امن کا بول بالا ہو گا۔ عام خیال یہی تھا سرد جنگ کی بدولت مختلف ممالک میں ایٹمی قوت بننے کی خواہش میں شدت پیدا ہوئی ہے اور اسلحے کی دوڑ میں اضافہ ہوا ہے۔ امریکہ کے تنہا عالمی سپر پاور بننے پر اس خیال کو تقویت ملی تھی کہ اب دنیا کے ممالک اور حکومتیں اپنا سرمایہ سامانِ حرب پر خرچ کرنے کی بجائے عوامی فلاح اور بہبود پر خرچ کریں گے۔ دنیا امن کی منزل کی طرف رواں دواں ہو گی اور انسانیت کو سکون میسر آئے گا۔ دنیا پر امریکہ کی تنہا اجارہ داری قائم ہونے کے بعد کم و بیش دس سال کا عرصہ ہی قدرے سکون سے گزرا تھا کہ 9/11 کا واقعہ رونما ہو گیا پھر اس کے بعد دنیا کے کئی ممالک ایک کے بعد ایک کر کے جنگ یا خانہ جنگی کا شکار ہوتے چلے گئے۔ عراق، افغانستان، پاکستان، شام، مصر، لیبیا اور کچھ افریقی ممالک شدت اور تسلسل کے ساتھ اس کا شکار ہوتے گئے۔ یہ بات بھی بڑی حیران کن ہے کہ مسلمان ممالک ہی اس بد امنی کا شکار ہو رہے ہیں۔ روس کے ٹوٹنے کے بعد امریکہ کے لیے دنیا پر اپنی دھاک بٹھانے کے واسطے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا بہت ضروری تھا۔ اس مقصد کی خاطر اس نے اپنی

مرضی کے میدان جنگ سجائے۔ عراق کے بعد افغانستان اس کے پسندیدہ میدان حرب رہے یہ سلسلہ اب بھی مختلف جگہوں اور شکلوں کے ساتھ جاری ہے۔امریکہ نے بلواسطہ یا بلاواسطہ طور پر کچھ گروپ ایسے بھی بنا رکھے ہیں کہ جن کے خلاف کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ جنگی کاروائی کا جواز پیدا کیا جاسکے۔القائدہ،طالبان،بوکوحرام اور داعش سمیت کئی ایک مسلح تنظیمیں مختلف ممالک کی سلامتی کے لیے خطرے کا باعث ہیں۔یہ ممالک ان تنظیموں سے نبرد آزما ہونے کے لیے اپنا کثیر سرمایہ اپنی حفاظت اور سامانِ حرب اکٹھا کرنے پر صرف کر رہے ہیں۔

اگر گزشتہ چھ سالوں کی عالمی تجارت کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دفاعی تجارت میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔صرف 2014 میں 64.4 ارب ڈالر کی تجارت ہوئی۔آئی ایچ ایس عالمی منڈی اور معیشت کے بارے میں تحقیق کرنے والی ایک معتبر کمپنی ہے اس نے اپنے جائزے میں انکشاف کیا ہے کہ سعودی عرب گزشتہ برس اسلحے کا سب سے بڑا خرید دار رہا ہے۔اس کمپنی کے مطابق اس اسلحے کی تجارت میں ریکارڈ اضافے کی وجہ دنیا میں فوجی طیاروں کی مانگ میں اضافہ اور مشرق وسطی اور ایشیائی بحر الکاہل میں بڑھتی ہوئی کشیدگی ہے۔گزشتہ دو سالوں سے اسلحے کی فروخت میں امریکہ پہلے نمبر پر رہا جبکہ اس کے بعد روس،فرانس،برطانیہ اور جرمنی کا نمبر رہا۔آئی ایچ ایس کی رپورٹ کے مطابق سعودی

عرب اور مشرق وسطیٰ کے ممالک اسلحے کے سب سے بڑے خریدار ہیں اور ان ممالک کو اسلحہ فروخت کرنے والا سب سے بڑا ملک امریکہ ہی ہے اور صرف امریکہ نے 2013 میں 6ارب ڈالراور 2014 میں 8.04ارب ڈالر کا اسلحہ فروخت کیا ہے باقی یورپی ممالک کی تجارت اس کے علاوہ ہے۔ یہاں ان رقوم کا ذکر نہیں ہے جو یہ ممالک چھوٹے ہتھیار خریدنے اور اپنی سلامتی کو محفوظ بنانے کے نظام کو بہتر بنانے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔

سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات اس اتحاد کا حصہ ہیں جس کا سربراہ امریکہ ہے اس اتحاد کا مقصد داعش کے توسیع پسندانہ عزائم کے خلاف مشترکہ جدوجہد کرنا ہے۔ دیگر ممالک بھی اپنی اپنی سلامتی کی خاطر دھڑا دھڑ اسلحہ خرید رہے ہیں اور یوں دن بدن اسلحے کی تجارت زور پکڑتی جارہی ہے اور یہ ایک منافع بخش کاروبار کے طور پر ابھر کر سامنے آرہی ہے۔ مہذب دنیا کو اس طرف توجہ دینا ہو گی۔ جو ممالک اسلحے کی تجارت میں بہت آگے ہیں اور یہ اب ان کا منافع بخش کاروبار بن چکا ہے ان کی عالمی سیاست پر گہری نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ ممالک اور اسلحے کے سرمایہ دار اپنے نفع کے لیے عالمی امن کو داؤ پر لگائے ہوئے ہیں۔ اسلامی ملکوں کو مل بیٹھ کر سوچنا ہو گا اور کوئی لائحہ عمل ترتیب دینا ہو گا۔ امریکہ اور یورپ کی مخصوص عالمی سیاست کو سمجھنا ہو گا۔ اسلحے کی اس تجارت اور کاروبار میں اسلامی دنیا کی افرادی قوت بھی ضائع

ہو رہی ہے اور سرمایہ بھی برباد ہو رہا ہے۔ اسلامی سربراہی کانفرنس کو آج انتہائی متحرک کرنے کی ضرورت ہے اور اسے امہ کے ان مسائل سے نبرد آزماء ہونے کے لیے بااثر کردار ادا کرنا ہوگا اور ان سازشوں کو بے نقاب کرنا ہوگا جو امہ کے خلاف ہو رہی ہیں۔

جنوبی ایشیا میں ہتھیاروں کی دوڑ

یہ بات اب تاریخی حقیقت بن چکی ہے کہ بھارت نے پاکستان کو دل سے تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔ بھارت خطے میں اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ پاکستان اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ روزِ اوّل سے ہی اس کی سلامتی کے درپے ہے۔ 65 اور 71 کی دو روایتی انداز میں لڑی جانے والی جنگوں کے بعد بھارت نے سول استعمال کی آڑ میں ایٹمی ہتھیاروں کے حصول کے لیے کوششیں تیز کر دی۔ پاکستان پر اپنی دھاک بیٹھانے کے لیے وہ ہر طرح کی جارحیت کا ارتکاب کرنے کی کوششوں میں لگا ہوا ہے۔ 1980 کی دہائی میں بھارت نے سرحدی کشیدگی میں اضافہ کیا اور بہاولپور سے پاکستان کو کاٹنے کا حتمی منصوبہ بنایا تھا مگر اس وقت ڈاکٹر قدیر خان نے ایک انٹرویو میں پاکستان کے پاس ایٹم بم کی موجودگی کا انکشاف کیا تھا جس پر بھارت کو اپنی مہم جوئی کو ترک کرنا پڑا تھا۔ 90 کی دہائی میں بھارت پر جنگی جنون ایک بار پھر سوار ہوا اور اس نے خطے میں اپنی بالادستی ثابت کرنے کے لیے ایٹمی دھماکے کر دیے جس کے جواب میں پاکستان نے بھی چاغی کے مقام پر ایٹمی دھماکے کر کے اپنی قوت کا اظہار کر دیا۔ کارگل کا آپریشن پاکستان میں سیاسی معاملے کی نظر ہو گیا مگر اسی آپریشن نے بھارت کو کسی بھی قسم کی سرحدی جارحیت سے باز رکھا ہے۔ بھارت ہمیشہ سے پاکستانی سرحد اور

لائن آف کنٹرول کے ساتھ ساتھ اپنا دباؤ برقرار رکھتا ہے اور وہ سقوطِ ڈھاکہ کی طرز پر کسی نہ کسی مہم میں مصروف رہتا ہے۔ اس صدی کے آغاز میں بھی بھارت نے سرحدوں پر غیر معمولی نقل و حرکت کی اور پھر 2004 میں اس نے کولڈ سٹارٹ ڈاکٹرائن متعارف کروایا۔ اس فوجی نظریہ کے مطابق بھارت نے سرحد کے ساتھ ساتھ مستقل طور پر چھوٹے چھوٹے فوجی یونٹ قائم کیے اور اس سے پاکستان پر دباؤ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان روایتی طریقہ دفاع پر بھرپور توجہ دے رہا ہے 60 کلومیٹر رینج کا حامل نصر میزائل بھی اسی مقصد کے لیے ہے۔ بھارت کے وہ چھوٹے فوجی یونٹ جو مستقل سرحدوں پر تعینات ہیں اب اس میزائل کی زد میں ہیں اور مہم جوئی سے باز آئے ہوئے ہیں۔ بھارت کا جوہری پروگرام اور عالمی منڈی سے فوجی ہتھیاروں کی بڑے پیمانے پر خریداری اس کے توسیع پسندانہ عزائم کو عیاں کرتی ہے۔

اپنی سرحدوں کا دفاع پاکستان کا بنیادی حق ہے اور کسی طور بھی اپنے اس حق سے دستبردار نہیں ہو سکتا ہے۔ بھارت کے مقابلے میں پاکستان ایک چھوٹا ملک ہے اور عددی اعتبار سے وہ ایک بڑی فوج نہیں رکھ سکتا ہے اسی لیے روایتی طریقہ کار کے ساتھ ساتھ اسے غیر روایتی طریقہ حرب کو بھی جدت کے ساتھ اختیار کرنا پڑ رہا ہے۔ 1998 میں ایٹمی دھماکے کرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان نے اپنا میزائل پروگرام بھی جاری رکھا اور وہ تا حال جاری ہے۔ پاکستان کے

میزائل پروگرام کا مقصد صرف اور صرف بھارت کو کسی بھی قسم کی جارحیت سے روکنا اور توسیع پسندانہ عزائم سے باز رکھنا ہے۔پاکستان یہ بات بخوبی سمجھتا ہے کہ ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے کے لیے نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان کا مقصد دشمن کو خبردار کرنے اور اسے مہم جوئی سے باز رکھنے کے لیے ہوتا ہے۔پاکستان نے 17 نومبر 2014 سے لے کر 14 مارچ 2015 تک بڑی تیزی سے مختلف قسم کے میزائلوں کے کامیاب تجربات کیے ہیں ان میں 350 کلومیٹر سے لے کر 2750 کلومیٹر تک مار کرنے والے میزائل شامل ہیں ان میزائلوں میں روایتی اور غیر روایتی ہتھیار لے جانے کی صلاحیت موجود ہے۔پاکستان کا اپنا تیار کردہ ڈرون طیارہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔اتنی کامیابیاں NUCLEAR حاصل کرنے کے باوجود پاکستان ایک ذمہ دار ملک ہے اور وہ جانتا ہے کہ کی سطح بلند سے بلند ترین ہونی چاہیے اور وہ جانتا ہے کہ اسے کہاں جا THRESHOLD کی restraint کر غیر روایتی ہتھیاروں کو استعمال کرنا ہے۔لیکن بھارت پاکستان کی پالیسی کو مختلف انداز میں آزماتا رہتا ہے۔یہی چیز خطے میں عدم استحکام اور ہتھیاروں کی دوڑ کا باعث بنتی ہے۔آج ضرورت اس امر کی ہے کہ عالمی معاشرہ پاکستان پر دباؤ بڑھانے کی بجائے بھارت کو مجبور کرے کہ وہ اپنے توسیع پسندانہ عزائم پر قابو پائے اور امریکہ کے ساتھ ایٹمی ٹیکنالوجی کی منتقلی اور ہتھیاروں کے حصول کے معاہدوں کی بجائے انسانی فلاح و بہبود پر توجہ صرف کرے۔اس خطے میں دنیا کی تقریباً 22 فیصد سے زیادہ آبادی کسی بھی ایٹمی

جارحیت کی متحمل نہیں ہو سکتی ہے۔

ایران کا جوہری پروگرام

پر امن نیوکلر پروگرام جاری رکھنا ہر ملک کا بنیادی حق ہے۔ دنیا میں بڑھتی ہوئی آبادی اور تیزی سے کم ہوتے ہوئے قدرتی وسائل کی بدولت اس ٹیکنالوجی کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ عمومی طور پر اس ٹیکنالوجی کو جنگ اور دفاع میں استعمال کی علامت سمجھا جانے لگا ہے اور عوامی تاثر یہ زور پکڑ رہا ہے کہ اس ٹیکنالوجی کا واحد مقصد تباہی اور بربادی ہے۔ اس تاثر کو زائل کرنے کی ضرورت ہے۔ ایٹمی ٹیکنالوجی کا سِول استعمال انسانیت کی فلاح اور بہبود کے لیے دورِ حاضر میں لازمی ہو گیا ہے اور مستقبل قریب میں اس کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ یہ ٹیکنالوجی قدرتی وسائل کے متبادل کے طور پر استعمال ہو گی۔ توانائی، زراعت، صحت، ادویات سازی سمیت کئی ایک شعبوں میں اس کا استعمال بنی نوح انسان کی بقا کا ضامن بن جائے گا۔

امریکہ اور یورپ کے جن ممالک کے پاس یہ ٹیکنالوجی موجود ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اب اس ٹیکنالوجی کا دیگر ملکوں میں منتقل ہونا عالمی امن کے لیے خطرناک ہے اور ان کو خدشہ لاحق ہے کہ اس کے پھیلاؤ سے دنیا میں تباہی پھیلے گی۔ اسی نکتہ کے پیشِ نظر اس ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ پر پابندی لگا دی گئی ہے اور یہ

کام اقوم متحدہ جیسے ادارے کے ذریعے کروایا گیا ہے۔ان بڑی طاقتوں کا خیال ہے کہ وہ ایٹمی ٹیکنالوجی پر اپنی گرفت برقرار رکھ کر دنیا کی دوسری اقوام پر اپنی اجارہ داری قائم رکھ سکتے ہیں اور باقی دنیا کی پسماندگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے وسائل کو بے دردی سے لوٹ سکتے ہیں۔یورپ اور امریکہ کی اس سوچ کی وجہ سے دیگر ملکوں میں اس ٹیکنالوجی کا حصول ایک چیلنج بن کر ابھرا ہے۔ایشائی اور اسلامی ممالک ان کی اجارہ داری کو ختم کرنے کے لیے اس ٹیکنالوجی کے حصول کے لیے اب دن رات ایک کیے ہوئے ہیں ۔بھارت،پاکستان اور شمالی کوریا کو اس سلسلے میں کامیابی مل چکی ہے جبکہ ایران اور اب سعودی عرب بھی اس کے حصول کے لیے کوشاں ہیں۔

آج کل ایران ایک ایسا ملک ہے جو اس ٹیکنالوجی میں مکمل صلاحیت حاصل کرنے کے بالکل قریب پہنچ گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور یورپ نے اس پر اقتصادی پابندیاں عائد کرکے دباؤ بڑھایا ہوا ہے۔اقوام متحدہ کا ادارہ بھی ان پابندیوں کی حمایت کرتا ہے ۔عالمی منڈی میں تیل کی تیزی سے کم ہوتی ہوئی قیمتیں بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ایران کی اقتصادی ترقی کا انحصار تیل پر ہی ہے اور اس کی کم قیمت نے ایران کی مشکلات میں شدید اضافہ کیا ہے عالمی معاشرے میں ایران تیزی سے تنہائی کا شکار ہوتا جا رہا ہے اور اس کے اثرات اس کے اپنے عوام پر بھی پڑ رہے ہیں مگر ایران اپنے موقف پر سختی سے

قائم ہے۔

عالمی منظر نامے میں 5 + 1 اور ایران کے درمیان مذاکرات کا بہت چرچا ہے۔ان مذاکرات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔5 + 1 کا خیال ہے کہ ایران ایٹمی ٹیکنالوجی حاصل کرنے کے بعد اپنے خطے کے ملکوں جن میں اسرائیل بھی شامل ہے کو نشانہ بنا سکتا ہے اور اس کے ایٹمی طاقت بننے سے خطے میں طاقت کا توازن بگڑ جائے گا۔ جبکہ ایران کا موقف مختلف ہے۔دنیا کو ایران کا موقف سمجھنے کی ضرورت ہے۔انقلاب کے بعد سے ایران میں دو متوازی نظام ہائے حکومت بڑی کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ایک سیاسی اور جمہوری حکومت ہے جس کے حسن روحانی سربراہ ہیں جبکہ دوسرا نظام ولایتِ فقیہی قائم ہے جس کے سربراہ علی خامنائی ہیں اور ایران میں یہ نظام نہایت مضبوط، موثراور طاقت ور ہے۔اگرچہ عالمی طاقتوں کے ساتھ مذاکرات حسن روحانی کی ٹیم کر رہی ہے مگر اس پر مکمل کنٹرول علی خامنائی کا ہی ہے۔ایران میں رہبر معظم کے فتوے کی اہمیت کلیدی ہے اور اس کی ایک مذہبی حیثیت ہے۔ان کے ایک فتوے کے مطابق ایٹمی ہتھیار بنانا حرام ہیں۔اس نورز کے موقع پر مشہد میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ ایران کا جوہری پروگرام مکمل طور پر پر امن ہو گا اور اس سے جنگی ہتھیار نہیں بنائے جائیں گے۔ایران کا ایٹمی پروگرام مکمل طور پر سول مقاصد کے لیے ہے اور ایران اپنے اس حق سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔اب دنیا کو ایران کا حق اسے

دینا ہو گا۔ سن 2000 میں بھی آئی اے ای اے نے ایران کے نیوکلر پروگرام کو مکمل طور پر پر امن قرار دیا تھا اور اب بھی اس کے موجودہ سربراہ یوکیا امانو نے ایران کے تعاون کو تسلیم کیا ہے اس ادارے نے اپنی تمام رپورٹوں میں اعتراف کیا ہے کہ ایران کے ایٹمی پروگرام میں کسی بھی قسم کا انحراف نہیں پایا جاتا ہے۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ دنیا ایران کے سول جوہری صلاحیت کے حصول کے حق کو تسلیم کرے اوران مذاکرات کو کامیاب بنایا جائے اور ایران سے پابندیاں اٹھا کر وہاں کی عوام کی مشکلات کو کم کیا جاے۔ اگر عالمی طاقتیں اپنے بے جا موقف پر قائم رہیں تو خدشہ ہے کہ ایران بھی اپنا موقف تبدیل کر لے گا۔ حکومتِ ایران کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنے روحانی پیشوا کے فتوے کی پاسداری کرتے ہوئے ایٹمی ہتھیار بنانے سے مکمل گریز کرے اور آئی اے ای اے کو اپنے جوہری پروگرام تک مکمل رسائی دے اسی میں خطے کے عوام کی بھلائی ہے۔

عرب سپرنگ، خزاں کی جانب

جب بھی کوئی معرکہ معرضِ وجود میں آتا ہے تو کوئی ایک فریق حق پر ہوتا ہے اور دوسرا باطل پر ہوتا ہے۔یعنی جنگ ہمیشہ ظالم اور مظلوم کے درمیان ہی ہوا کرتی ہے ایسا ممکن نہیں کہ لڑنے والے دونوں فریق مظلوم یا ظالم ہی ہوں۔دنیا میں جتنی بھی جنگیں لڑی گئی ہیں ان کی ابتدا اس وقت ہوئی جب کسی ایک فریق نے اپنے حق سے تجاوز کیا ہو۔جب بھی دو قومیں یا ملک ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہوتے ہیں تو ان کے بھی پیشِ نظر یہی فارمولا ہوتا ہے۔جب بھی کوئی قوم اپنی سوچ، فکر اور نظریہ کسی دوسری قوم پر مسلط کرنے کی کوشش کرنے لگے تو جنگ کی چنگاری جلنے لگتی ہے اور جب کوئی ملک کسی دوسرے ملک کی زمین، وسائل اور دولت کو حاصل کرنا چاہے تو جنگ کے طبل بجنا شروع ہو جاتے ہیں۔جنگیں کبھی غلط فہمی کی بنیاد پر شروع نہیں ہوا کرتی بلکہ ان کے پیچھے ایک منظم سوچ اور حکمتِ عملی کارفرما ہوتی ہے۔ہاں البتہ جب کسی ظالم جنگجو کو تاریخ میں معزز مقام دلوانا مقصود ہو تو اس کی جنگوں کو کسی غلط فہمی کا سبب قرار دیا جاتا ہے۔تاریخ ایسے نام نہاد اسباب سے بھری پڑی ہے جبکہ حقائق بھی تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔

اس وقت عالمی ذرائع ابلاغ میں یمن اور سعودی عرب کے تنازع کا ذکر بڑی شد ومد کے ساتھ ہو رہا ہے۔ خبریں، تبصرے اور تجزیے بڑے اہتمام کے ساتھ پیش کیے جا رہے ہیں۔ عالمی ذرائع ابلاغ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک گروپ سعودی عرب کی حمایت کرتا ہے جبکہ دوسرا یمن کے حق میں ہے۔ ذرائع ابلاغ کی اس تقسیم نے عالمی سیاست کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے ایسی رائے عامہ ہموار کی گئی ہے جس سے یہی تاثر ابھرتا ہے کہ وقت ایک بار پھر کسی ایک بڑے حق و باطل کے معرکے کو دیکھنے لیے بیتاب ہے۔ خدا رحم کرے اس متوقع جنگ سے اب کی بار کوئی محفوظ نہیں رہ پائے گا اور مسلم امہ ایک ایسی آگ میں جلے گی جس کی تپش اب رہتی دنیا تک محسوس کی جاتی رہے گی۔ اس تنازع کی وجوہات کو دیانت داری کے ساتھ تلاش کیا جائے تو اس کا ایک سرا سعودی عرب اور دوسرا ایران کے ساتھ جا ملتا ہے۔ دونوں اسلامی ملک ہیں ۔ اسلامی تعلیمات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ دونوں طرف جید علماء کرام اور مذہبی سکالرز موجود ہیں۔ حقیقی اسلام کے تصور کو پہچانتے ہیں اور حق و باطل کے درمیان تفریق کا شعور بھی رکھتے ہیں۔ مسلم امہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی کہ ان دو ممالک کی قیادت کسی باطل رستے پر چلنے کی جسارت کر سکتی ہے۔ مگر یہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ صورت احوال مختلف ہے۔ دونوں ملکوں نے یمن کو اپنے لیے میدان جنگ چن رکھا ہے۔ حوثی قبائل اور ان کے اتحادیوں کی ایران کھل کر مدد بھی کر رہا ہے اور حمایت بھی کرتا ہے جبکہ دوسری جانب سعودی عرب کے فضائی حملے کسی سے پوشیدہ

نہیں ہیں ۔ایک قوم کا ہیرو، دوسری قوم کا دشمن کے مصداق ہر کوئی اپنے مرنے والوں کو شہید اور دوسرے کے مرنے والوں کو ہلاک لکھتا ہے۔ مگر ان 62 بچوں کے متعلق کیا لکھا جائے جو سعودی فضائی حملے میں اپنی زندگیوں سے محروم ہوگئے ہیں ۔اسی طرح روزانہ درجنوں عام خواتین اور مردوں کو موت کی وادی میں دھکیلا جا رہا ہے۔ان بے گناہوں کی موت کی ذمہ داری کس کے سر ہے۔اسلامی قیادت کو اس پر غور اور فکر کرنا چاہیے آخر انہوں نے بھی حق کے سامنے پیش ہونا ہے اس خون کا حساب دینا ہے ۔آج اس دنیا کے ذرائع ابلاغ اور یہاں کے مورخ کو تو اطمینان دلایا جا سکتا ہے مگر یوم حساب حق کے سامنے یہ کس طرح اپنا دفاع کریں گے انہیں اس کی فکر کرنا ہو گی۔

18 دسمبر 2010 میں تیونس میں ایک تحریک شروع ہوئی جسے عرب سپرنگ کا نام دیا گیا تھا۔ یہ تحریک مصر، لیبیا، یمن، اردن، کویت سمیت کئی اسلامی ملکوں تک پھیلی۔اس تحریک کے شروع ہونے پر جن ملکوں کے حکمرانوں نے خوشی کو اظہار کیا تھا جب یہ ان کے ملکوں میں پہنچی تو وہی حکمران پریشان اور دربدر ہوئے ۔اس تحریک نے بادشاہت اور ملوکیت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔اس تحریک کی ابتدا میں نہ ہی اس کی وجوہات کو سمجھا گیا اور نہ ہی مستقبل میں اس کے ظاہر ہونے والے اثرات کا جائزہ لیا گیا۔ مسلم قیادت ریت میں سر دبائے بیٹھی رہی اور اب یہ بہار ان کے لیے خزاں بن کر نازل ہو رہی ہے ۔اسلامی ملکوں کی

نوجوان نسل ملوکیت سے تنگ آچکی ہے ان کی اس بیزاری کو مغرب اور امریکہ نے اسلامی ملکوں میں انتشار کے لیے خوب استعمال کیا ہے۔اسلامی قیادتیں بھی اپنے اقتدار کو طول بخشنے کے لیے امریکہ اور یورپ کے آلہ کا بنے رہیں اور یوں مسلم خطہ ایک بڑی خون ریزی کے لیے تیار ہو چکا ہے۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلم قیادت ایک جگہ مل بیٹھے اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ان تمام مسائل کا حل نکالے جن کی بدولت خطے میں انتشار پھیل رہا ہے۔انسانی جان کی جو قدر و منزلت اسلام نے بتائی ہے اس کا ادراک کرنے کی آج اشد ضرورت ہے۔مسلمانوں کو جنگ کا ایندھن بننے سے محفوظ کیا جائے۔اگر اب مسلمان قیادت کی طرف سے تدبر اور فہم و فراست کا مظاہرہ نہ کیا گیا تو ان کے مقدر میں ایسی خزاں لکھ دی جائے گی کہ جس کے بعد پھر کبھی بہار نہ ہو گی۔

ایران جوہری معاہدہ اور پاکستان پر اس کے اثرات

دو اپریل کو ایران اور چھ عالمی طاقتوں کے درمیان جوہری پروگرام سے متعلق عبوری معاہدہ سوئیٹزر لینڈ میں طے پا گیا ہے۔اس معاہدے کے بعد دونوں فریقوں نے خوشی کا اظہار بھی کیا ہے اور اسے اپنے اپنے لیے ایک بڑی کامیابی قرار دیا ہے۔ اگرچہ اس معاہدے کو حتمی شکل 30 جون کو دی جانی ہے مگر عالمی معاشرہ اس پر ابھی سے خوشی کا اظہار کر رہا ہے۔یورپ اور امریکہ کا خیال ہے کہ انہوں نے ایران کو ایٹم بم بنانے سے روک دیا ہے جبکہ ایران کا موقف اس کے سول استعمال کا رہا ہے۔اس معاہدے کے بعد سے ایران پر عائد پابندیاں بھی ختم ہو جائیں گی اور اسے بینک اکاؤنٹس اور تیل کی مارکیٹ تک رسائی بھی حاصل ہو جائے گی۔

اگرچہ یہ معاہدہ ایران اور چھ عالمی طاقتوں کے درمیان ہے اور اس میں پاکستان کا بظاہر دور دور تک کوئی ذکر نہیں ہے تاہم اس کے اثرات پاکستان پر بہت گہرے ہیں۔جب تک ایران پر پابندیاں تھی اس وقت کا ایران کچھ اور تھا اور اب اقتصادی پابندیوں کے خاتمے بعد کا ایران مختلف ہو گا۔اس کے مفادات،ترجیحات اور اہداف میں واضح تبدیلی نظر آئے گی۔عبوری معاہدے کی خبر

کے ساتھ ہی ایران میں خوشی کا سماں ہر کسی نے دیکھا ہے ان کی حکومت کا لب ولہجہ تبدیل ہوتا ہوا دیکھائی دے رہا ہے۔ پاکستان کے ساتھ ایران کے تعلقات تاریخی اعتبار سے عمدہ رہے ہیں مگر موجودہ اقتصادی پابندیوں کے عرصہ میں کچھ کچھاؤ بھی دیکھائی دیا گیا ہے۔ اس عرصہ کے دوران ایران پاکستان کو گیس اور بجلی فروخت کرنا چاہتا تھا اور پاکستان اس کو خریدنے کے ارادہ بھی رکھتا تھا مگر عالمی پابندیوں کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ ایران کی یہ شدید خواہش تھی کہ پاکستان اس کے مشکل وقت میں کام آئے اور اچھے دوست اور ہمسائے کا ثبوت دے مگر پاکستان امریکی دباؤ کی وجہ سے اس کی خواہشات پر پورا نہ اتر سکا۔ پاک ایران گیس منصوبہ تاخیر کا شکار ہوتا چلا گیا۔ اب پاکستان اس منصوبے کی جلد تکمیل کی خواہش رکھتا ہے مگر ایران کی طرف سے وہ گرمجوشی اب دیکھنے کو نہیں مل رہی ہے۔ اس کی نظر پاکستان کی سعودی عرب میں اپنی افواج کو بھیجنے کی پالیسی پر ہے۔ اب یہ اندازے حقیقت میں بدل چکے ہیں کہ ایران یمن میں مکمل طور پر دلچسپی لے رہا ہے اپنے مشکل ترین اقتصادی دور میں بھی اس نے حوثی قبائل کی ہر طرح کی مدد کی ہے اور اب کس طرح اپنے اچھے دنوں میں وہ ان سے منہ موڑ سکتا ہے۔ اگر کسی بھی مرحلے پر پاکستان اپنی افواج سعودیہ روانہ کرتا ہے یا یمن کے مسلے پر ایران مخالف پالیسی اختیار کرتا ہے تو اسے ایران سے اچھائی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ وہ بلوچستان میں ہزارہ قبیلے کو متحرک کرکے پاکستان کے لیے مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ ماضی میں

افغان جنگ میں پاکستان کی شمولیت کے اثرات اب تک کے پی کے میں نظر آ رہے ہیں۔

بھارت نے گیس منصوبے سے خود کو الگ کر لیا تھا مگر ایران نے اسے بندر عباس میں سرمایہ کاری کے بھرپور مواقع دیے ہیں یوں ایران اور بھارت ایک دوسرے کے بہت قریب آ چکے ہیں۔ جوہری معاہدے کے بعد ایران اپنی تمام تر تجارت یورپ کے ساتھ ہی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے مگر وہ بھارت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتا ہے۔ بھارت ایران میں کثیر سرمایہ کاری کرنے کا خواہش مند بھی ہے۔ اگر یہ دونوں ملک ایک دوسرے کے مزید قریب آتے ہیں اور افغان پالیسی پر ایک ہی موقف اختیار کرتے ہیں تو خطے میں پاکستان کے لیے مشکلات میں اضافہ ہوگا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ماضی قریب میں پاکستان کی سرد مہری کی وجہ سے ایران کا جھکاؤ بھارت کی طرف زیادہ ہوا ہے۔ روس کی قربت ایران کے ساتھ واضح ہے۔ یمن کے مسلے پر بھی وہ سعودی عرب اور اس کے اتحادیوں کے فضائی حملوں پر تحفظات رکھتا ہے اور اب اس نے ان حملوں کو روکنے کرنے کا مطالبہ بھی کر دیا ہے۔ چینی صدر کے دورہ پاکستان کا بار بار التوا بھی پاکستان کے لیے مایوس کن ہے۔ اب اس خطے کے ممالک کا جھکاؤ پاکستان سے تبدیل ہو کر ایران کی طرف ہوتا دیکھائی دے رہا ہے۔

اس سارے منظر نامے میں پاکستان کو اپنی خارجہ پالیسی پر نظر ثانی کرنا ہو گی۔اب یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ کس طرح اپنے آپ کو اس خطے میں تنہائی سے بچا پاتا ہے کیونکہ پاکستان کے ہاں غیر جانبداری کی کوئی روایت موجود نہیں ہے اسی لیے اگر اس نے اپنی موجودہ پالیسی جاری رکھی تو اس کی مشکلات میں اضافہ ہو گا۔ پاکستان نے ماضی میں بھی سمندر پار ملکوں سے دوستی نبھائی ہے اور ہمسایوں کے ساتھ تعلقات کشیدہ رکھے ہیں۔اس پالیسی کی پاکستانی عوام نے بھاری قیمت چکائی ہے۔اگر پاکستان ایران کے برعکس سعودی عرب اور چین و روس کی جگہ امریکہ کو ترجیح دیتا ہے تو انتشار ایک طویل عرصے تک پھر اس خطے کے عوام کا مقدر بن جائے گا۔

امن کے لیے علم کی ضرورت

آج کل یورپ میں زیر بحث موضوعات میں موسمیاتی تبدیلیاں ایک اہم اور بنیادی موضوع ہے۔ وہاں کا میڈیا اور سیاستدان دنیا کو درپیش اس چیلنج پر گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی تمام تر فکر اور نظر عالمی درجہ حرارت میں اضافے پر مرکوز ہے۔ وہ اس بات پر فکر مند ہیں کہ اگر موسمی درجہ حرارت میں اسی رفتار سے اضافہ ہوتا رہا تو آنے والے وقتوں میں موسم کی شدت اور اس کے ناموافق اثرات سے کس طرح نمٹا جائے گا۔ ان کے ہاں عالمی امن پر گفتگو اور مباحثے کم ہی ہوتے ہیں ایشیا میں سلگتے ہوئے جنگ کے شعلوں کی تپش سے وہ خود کو میلوں دور محسوس کرتے ہیں ۔ مسلم ممالک میں ہونے والی خون ریزی کے متعلق ان کی سفارتی تشویش تو سامنے آتی ہے مگر بطور ریاست وہ ان سارے امور سے الگ تھلگ ہیں۔ ہاں البتہ جہاں امریکہ کو ضرورت محسوس ہو وہاں وہ مذاکرات کے لیے دستیاب ہوتے ہیں اور اپنی تجارت کی فکر میں ایران کے ساتھ معاملات بھی طے کر لیتے ہیں ۔ جب تک ان کی تجارت اور معیشت ترقی کر رہی ہے انہیں کسی اور جانب توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ باقی براعظموں کے معاملات میں براہ راست الجھنے سے گریز کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یورپی معاشرہ انسانی جان کے حوالے سے پر امن معاشرہ ہے اور وہاں زندگی پر سکون ہے۔

اگر ہم ایشیائی ممالک پر نظر ڈالیں تو یہاں بھی کچھ ممالک میں زندگیاں محفوظ اور انسانی جان کی قدر و قیمت باقی ہے۔ جنوبی کوریا، چین، ملائشیا، سنگاپور، تائیوان، چین، جاپان، سری لنکا اور کسی حد تک ترکی وغیرہ ایسے ممالک ہیں جہاں زندگی خوبصورت ہے اور وہاں کے معاشرے پر امن ہیں۔

اگر موجودہ دور میں مسلم ممالک کو دیکھا جائے تو بڑے دکھ سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کے معاشرے انتشار اور بدامنی کا شکار ہیں۔ ان معاشروں میں انسانی جان کی وہ قدر و منزلت نہیں جو دوسروں کے ہاں ہے۔ جنگ و جدل اور مسلح جدوجہد ان کا شوق بنتا جا رہا ہے۔ قتال اور جہاد کے نظریات پروان چڑھ رہے ہیں۔ فرقے کی بنیاد پر ایک دوسرے کو مارنے کی باتیں اب عام ہوتی جا رہی ہیں تاریخ کے پرانے اوراق نکال کر اپنی اپنی فضیلت اور حقِ ملکیت کو ثابت کیا جانے لگا ہے۔ قبائلی سوچ اجتماعی سوچ پر غالب آنے لگی ہے۔ ایک دوسرے کو کافر، مرتد اور خارج از اسلام ثابت کرنے کے لیے خون کے دریا عبور کر لیے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے پر فوقیت اور برتری صرف لاشوں کے ڈھیر پر چڑھ کر ہی ثابت کی جا سکتی ہے۔ عام لوگ تو ایک طرف اب حکومتیں بھی اس کھیل میں شامل ہو چکی ہیں۔ پرانے وقتوں میں جھانکنے کی ضرورت نہیں 1980 کی دہائی سے شروع ہونے والی ایران اور عراق کی جنگ سے لیکر اب یمن سعودی انتشار تک فرزندانِ توحید کی

ایک بڑی تعداد اپنی زندگی جیسی خوبصورت نعمت سے محروم ہوئی۔ایک بڑی تعداد زخمی ہو کر اپاہج ہوئی اور لاکھوں عورتیں بے آسراء ہوئی۔یہ سب کس کی وجہ سے اور کیوں ہوا؟یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب تلاش کرنا ضروری ہے مگر اس کا جواب صرف اور صرف مذاکرے اور مطالعہ کے ذریعے ہی تلاش کیا جانا چاہیے۔سب کچھ اغیار اور استعمار پر ڈال دینا ہی کافی نہیں ہے۔اس کشت و خون میں اپنوں کے بھی ہاتھ رنگین ہیں ۔مسلم معاشرے کو تدبر اور فکر کی آج جتنی ضرورت ہے شاہد ہی تاریخ میں اس سے قبل اتنی کبھی ہو۔

آج کا مسلم معاشرہ تیزی سے ایک نئی جنگ کا شکار ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔لاشوں کا بنتا ہوا پہاڑ اور خون کا بہتا ہوا دریا ہر آنکھ دیکھ رہی ہے۔ایسے میں اہل علم،ادیب اور دانشور طبقے کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے وہ مسلم امہ کی رہنمائی کر سکتے ہیں علماء اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں انسانی جان کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔حکمت مومن کی گم شدہ میراث ہے یورپ سے بھی رہنمائی لی جا سکتی ہے وہاں انسانی جان کی حد درجہ قدر و منزلت پائی جاتی ہے۔کسی کی جان لینے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا ہے انہوں نے امن علم کی بدولت حاصل کیا ہے۔انہوں نے خطبہ حجتہ الوداع پر خلوص کے ساتھ عمل کیا ہے اور مسلمان اس سے دور ہوتے چلے گئے ہیں وہ اسلامی تعلیمات کے قریب ہو کر امن کی منزل پا گے اور مسلمان اپنی تعلیمات سے دور ہو کر دنیا کو اپنے لیے

جہنم بنا بیٹھے ہیں۔ مسلم معاشرے میں اس حکم کو دوبارہ اپنی زندگی کا منشور قرار دینے کی ضرورت ہے جس میں کہا گیا کہ آج کے بعد کسی کالے کو کسی گورے پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فوقیت نہیں۔جان مال اور عزت کی حرمت کا حکم پھر سے یاد کرنے کا وقت ہے۔ جہاں علم حاصل کرنے کو فرض قرار دیا گیا ہو وہاں جہالت کا کیا کام ہے۔ مسلم امہ کو آج شہر علم میں داخل ہونے کی ضرورت ہے۔دروازہِ علم سے ہی علم کی خیرات مل سکتی ہے اسی دروازے سے امن اور انسانی جان کی قدر معلوم کی جا سکتی ہے ۔جہاں اپنے قاتل کو بھی شربت پلایا جاتا ہو وہاں سے نفرت کبھی بھی نہیں پھوٹ سکتی ہے۔لہٰذا مسلم معاشرے کو اپنی اصل کی ہی طرف لوٹنا ہو گا اور علم کے ہتھیار سے جہالت کے دشمن پر وار کرنا ہو گا اسی حربے سے وہ سرخرو ہو سکتے ہیں۔

پاک بھارت مذاکرات کی منسوخی پر ہنگامہ کیوں؟

مشیروں کی سطح پر ہونے والے پاک بھارت مذاکرات منسوخ ہونے پر ایک شور بپا ہے۔ایک عمومی تاثر ایسا ابھر کر سامنے آ رہا ہے کہ جیسے کوئی قیامت آئی اور گزر گئی ہو۔اس سے قبل بھی پاکستان اور بھارت کے درمیان کئی بار مختلف سطحوں کے مذاکرات ہوتے بھی رہے اور منسوخ بھی ہوتے رہے ہیں مگر اس بار کا شور ذرا معنی خیز ہے۔اس سے قبل بھارت مذاکرات منسوخ یا ملتوی کرنے کا اعلان کرتا رہا ہے اور پاکستان نے ہمیشہ صبر کے ساتھ ہر طرح کے حالات میں مذاکرات کیے ہیں۔تاریخی اعتبار سے یہ پہلا موقع ہے کہ مذاکرات کی منسوخی کا اعلان پاکستان کی طرف سے کیا گیا ہے اور یہی بات اہم ہے۔

پاکستان اور بھارت کے تعلقات تاریخ میں کبھی بھی مثالی نہیں رہے ہیں۔بھارت درحقیقت پاکستان کو کسی صورت ترقی کرتے نہیں دیکھ سکتا ہے اسے برصغیر کی تقسیم کا دکھ آج تک نہیں بھولا ہے۔وہ روزِ اول سے ہی اس خطے کا طاقتور ترین ملک بننے کا خواب دیکھ رہا ہے اب اس کی نظر سلامتی کونسل کی مستقل نشست پر بھی ہے۔کسی بھی ملک اور قوم کو ترقی کرنے کا حق حاصل ہے مگر ترقی کا یہ سفر دوسری اقوام اور ملکوں کو اپنے پاؤں تلے روند کر نہیں طے نہیں کیا جا سکتا

ہے۔ بھارت کی یہ خواہش ہے کہ خطے کے دیگر ممالک اس کے زیر نگیں ہوں اور ان کی تقدیر کے فیصلے وہ خود کرے۔ وہ ان ممالک پر اپنا اثر و رسوخ قائم کرنا چاہتا ہے بنگلہ دیش کے ساتھ اس کا حالیہ رویہ سب کے سامنے ہے۔ وہاں کی حکومت بھی اپنی عوام کی خواہشات کے برعکس بھارت کی بالادستی کو تسلیم کر چکی ہے۔ بھارت کے ان توسیع پسندانہ عزائم کے سامنے پاکستان ہی ڈٹا ہوا ہے اور دیگر چھوٹے ملکوں کی آس اور امید بھی اسی سے وابستہ ہے۔

پاکستان 11/9 کے بعد سے دہشت گردی کی جنگ میں الجھا رہا ہے۔ ابتدا میں اسے اپنے دشمنوں کو شناخت کرنے میں مشکلات کا سامنا رہا ہے۔ یہ جنگ ملک کے اندر ہی لڑی جا رہی تھی اسی وجہ سے پاکستان کے سیکورٹی کے اداروں کو اس سے نبرد آزما ہونے میں کافی مشکلات درپیش رہی۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں کی قوم، حکومت اور افواج پاکستان نے اس جنگ کی وجوہات کا پتہ چلا لیا۔ برسوں کی محنت اور لگن نے اپنا رنگ دیکھانا شروع کیا اور پاکستان کے چھپے دشمن ظاہر ہونے لگے۔ پاکستان کے اندر ہونے والی دہشت گردی کی وارداتوں میں بھارت کے ملوث ہونے کے ٹھوس ثبوت سامنے آئے ہیں۔ پاکستانی مشیر خارجہ سرتاج عزیز کا کہنا ہے کہ اب وہ یہ تمام ثبوت اقوامِ متحدہ کے پلیٹ فارم سے پوری دنیا کو دیکھائیں گے۔ ان ثبوتوں کو دیکھنے کے بعد عالمی برادری یقینا بھارت کے بارے میں اپنی رائے کا از سر نو جائزہ لے گی۔

پاک بھارت تعلقات میں امریکی کردار کو نظرانداز کرنا اب ممکن نہیں رہا ہے۔اس خطے میں اس نے اپنا اثر رسوخ پاکستان کے ذریعے ہی رکھا ہے رشین وار سے لیکر موجودہ افغان وار تک اس نے پاکستان کو دوستی کے نام پر استعمال کیا ہے جس کی قیمت پاکستان نے خوب چکائی ہے۔اب پاکستانی قوم نے اپنی اس پالیسی پر نظرثانی کی ہے اور اپنے ہمسایہ ملک چین کے ساتھ تعلقات کو مزید استوار کیا ہے۔پاک چین اقتصادی راہداری منصوبہ بھارت،امریکہ سمیت دنیا کے کئی ممالک کی آنکھ کا بال بنا ہوا ہے۔یہ قوتیں اس منصوبے کو سبوتاژ کرنا چاہتی ہیں۔اب پاکستانی قوم یہ سمجھتی ہے کہ یہ قوتیں بھارت اور افغانستان کے ذریعے پاکستان کو للکار رہی ہیں اور پاکستان پر ایک محدود جنگ مسلط کرنا چاہتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اب آئے روز بھارتی اور افغان سرحدی فورسز پاکستانی حدود کی خلاف ورزی کر رہی ہیں اور اس طرف گولہ باری کر رہی ہیں۔ان کا مقصد اس راہداری منصوبے کا ختم کرنے کے لیے پاکستان پر دباؤ ڈالنا ہے۔

ان مذاکرات سے قبل بھارت نے یہ شرط عائد کی ہے کہ سرتاج عزیز کشمیری رہنماؤں سے ملاقات نہیں کریں گے۔اس نے یہ شرط صرف دنیا کو دیکھانے کے لیے رکھی ہے مگر اس کے عزائم امریکی خواہشات کی تکمیل ہیں۔پاکستان نے اس چال کو بخوبی سمجھتے ہوئے اور کسی بھی قسم کے دباؤ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ان

مذاکرات سے انکار کیا ہے۔اس نے اپنے دشمنوں کو یہ باور کروایا ہے کہ وہ نہ صرف کشمیریوں کی حمایت سے دستبردار ہو گا بلکہ اقتصادی راہداری منصوبے سے بھی پیچھے نہیں ہٹے گا۔اسی وجہ سے پاکستان مخالف قوتیں ان مذاکرات کی منسوخی پر تیخ پا ہیں۔

جنگ کوئی بھی ہو کیا ہم تیار ہیں؟

اس سال پاکستان 65 کی جنگ کی پچاس سالہ تقریبات منا رہا ہے۔ان تقریبات میں ملک کی خاطر جانیں دینے والوں کو خراج تحسین پیش کیا جا رہا ہے اور وطن کے دفاع کا عہد بھی کیا جا رہا ہے۔اس سال 6 ستمبر کو جس جوش و جذبے کا مظاہرہ کیا گیا ماضی میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔اس کی بنیادی وجہ گزشتہ چند ماہ سے بھارت کی ایل ۔او۔سی اور ورکنگ باونڈری پر اشتعال انگیزی ہے۔بھارتی وزیر اعظم مودی پاکستان کے خلاف بیانات دینے میں کافی مہارت دیکھاتے ہیں اور وہ ہر موقع پر پاکستان مخالف بیانات دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔بھارت پاکستان کو زچ کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے اور اس کے دماغ پر جنگی جنون سوار ہے۔1948 کی کشمیر وار سے لے کر کارگل کی جنگ تک ہر موقع پر اسے میدانِ حرب میں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔وہ پاکستان کو جنگی میدان میں نیچا دیکھانے کے لیے ہر لمحے نئے نئے منصوبے بناتا رہتا ہے۔پاکستانی افواج کا مقابلہ اس کے بس کی بات نہیں ہے وہ نفسیاتی طور پر پاک فوج کی دہشت سے دبکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ آئے روز پاکستان کے خلاف نت نئی سازشیں تیار کرتا رہتا ہے۔پاکستان میں ہونے والی حالیہ دہشت گردی میں بھارت کے ملوث ہونے کے ثبوت سامنے آنے پر وہ مزید سیخ پا ہو گیا ہے۔پاکستان نے یہ ثبوت دنیا کے سامنے پیش کر دیے ہیں مزید اقوام

متحدہ کے اجلاس کے دوران وہاں آئے ہوئے عالمی رہنماؤں کو بھی ان شبوتوں کے بارے میں گاہ کیا جائے گا۔ عالمی سطح پر اپنے خلاف شبوتوں سے توجہ ہٹانے کے لیے بھارت سرحدوں پر مہم جوئی کرنا چاہتا ہے۔اس کا خیال ہے کہ وہ ایسا کرکے اقوامِ عالم کی توجہ کسی اور طرف مرکوز کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔مزید وہ سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ کرکے پاکستان پر اپنا دباؤ بڑھانا چاہتا ہے۔

اس سال 6 ستمبر کو آرمی چیف راحیل شریف نے اپنے خطاب میں بھارت کے تمام تر منصوبوں کو مسترد کر دیا ہے اور اسے خبر دار کیا ہے کہ پاکستان اس کی ہر قسم کی جارحیت کا بھرپور جواب دے گا۔انہوں نے 2004 میں بھارت کی طرف سے بنائی جانے والی کولڈ سٹارٹ پالیسی کے تحت لڑی جانے والی جنگ کا بھی بھرپور انداز میں جواب دینے کا اعلان کیا ہے۔اس پالیسی کے تحت بھارت اپنی افواج سرحدوں کے قریب لے آیا ہے اور اس نے فوجی چھاؤنیوں کو بھی سرحدوں کے قریب قائم کر لیا ہے۔اس کے خیال کے مطابق وہ 72 گھنٹوں کے اندر پاکستانی علاقوں پر قبضہ کر سکتا ہے۔پاکستانی آرمی چیف نے نہ صرف اس بھارتی منصوبے کا جواب دینے کا اعلان کیا بلکہ ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا کہ اگر اس کے ذہن میں کوئی ہاٹ سٹارٹ پالیسی بھی ہے تو پاکستانی فوج اس کے لیے بھی تیار ہے۔عمومی طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ بھارت کی کولڈ سٹارٹ پالیسی کے مقابلے میں اب پاکستان ہاٹ سٹارٹ پالیسی پر خود عمل کرے گا ۔یہ اصطلاع

بالکل نئی ہے جس کا ذکر آرمی چیف نے پہلی بار اپنے خطاب میں کیا ہے۔پاکستانی فوج اپنی سرحدوں کا دفاع ہر قیمت پر کرنا جانتی ہے۔اس نئی پالیسی کے مطابق اگر بھارتی افواج سرحدوں پر اکٹھا ہونا شروع ہوں تو پاکستانی فوج ان پر فوری طور پر حملہ کر دے گی۔آرمی چیف نے روایتی جنگ، غیر روایتی جنگ، کولڈ سٹارٹ وار اور ہاٹ سٹارٹ وار الغرض ہر قسم کی جنگ لڑنے کا عزم کیا ہے۔انہوں نے کہا ہے کہ پاکستانی فوج دنیا کی بہترین فوج ہے بلاشبہ اس فوج کو ہر قسم کی جنگ لڑنے کا وسیع تجربہ ہے۔اسی تجربے نے راحیل شریف کو اعتماد دیا ہے پوری پاکستانی قوم ملک کے دفاع کی خاطر اپنی افواج کے ساتھ ہے۔اس سے قبل بھارتی آرمی چیف نے بیان دیا تھا کہ ان کی فوج ایک مختصر جنگ کے لیے تیار رہے مگر راحیل شریف نے اپنے خطاب میں اس کا بھرپور جواب دیا ہے۔اب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پاکستان یہ جنگ شروع ہونے سے قبل ہی ہاٹ سٹارٹ پالیسی کے تحت اسے ختم کر دے گا۔

یہ بات باعثِ اطمینان ہے کہ پاکستانی افواج ہر قسم کی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کیے ہوئے ہے۔ہر قسم کی جنگ لڑنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔نت نئی تیکنیکوں سے نبرد آزما ہونے کا ڈھنگ بھی انہیں آتا ہے۔مگر ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ پاکستان کو ابھی اور بہت کچھ کرنا باقی ہے۔اگر بھارت ایبٹ آباد طرز کی طرح کا کوئی آپریشن پاکستان میں کرتا ہے تو اس کا

ردِ عمل کیا ہو گا؟ بھارت جماعت الدعوۃ اور لشکرِ طیبہ کے خلاف چو.ر.جی اور مریدکے پر اس قسم کی کاروائی کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔ایسا ہونے کی صورت میں پاکستان کے آپشن اور تیاری کیا ہو سکتی ہے اس پر بھی سپہ سالار کو سوچنا ہو گا اور اس بارے میں بھی حکمتِ عملی ترتیب دینا ہو گی اور قوم کا بتانا ہو گا کہ کیا ہماری افواج اس قسم کی ریڈ کو روکنے کے لیے بھی تیار ہیں؟

یورپ میں پناہ گزینوں کا معاملہ اور اسلامی اخوت

شام میں جاری خانہ جنگی کا چوتھا سال ہے۔بشار الاسد اب تک اقتدار پر قابض ہے۔امریکہ کی خواہش تھی کہ اسے اقتدار سے الگ کر دیا جائے مگر تقدیر اب تک اس کا ساتھ دے رہی ہے۔وہ اپنے خلاف بغاوت کرنے والوں کے خلاف بھی ڈٹا ہوا ہے اور آئی لیس آئی ایس کے خلاف بھی نبرد آزما ہے۔اس چار سالہ خانہ جنگی نے شام کے لوگوں کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔شام کی گرتی ہوئی اقتصادی حالت نے اس ملک کی زمین ان پر تنگ کر دی ہے۔موت کا سایہ ہر وقت شامیوں کے سر پر منڈلا رہا ہے۔فضائی حملے سب سے زیادہ خطرناک ہیں۔اپنی اور اپنے بچوں کی زندگیوں کے بارے میں فکر مند لوگ وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہیں۔اس وقت شام کی کل آبادی ڈھائی کروڑ ہے اور اس میں سے 40 لاکھ سے زائد شامی ترکی، لبنان، اردن، اور عراق میں خیمہ زن ہیں۔لبنان میں ہر چوتھا فرد پناہ گزین ہے۔شام میں خانہ جنگی کے پہلے سال سے ہی پناہ گزین ان ملکوں میں آنا شروع ہو گئے تھے مگر ان اسلامی ممالک نے ان پناہ گزینوں کے بارے میں کوئی شور نہیں مچایا تھا بلکہ اپنے وسائل کے مطابق ان کی ہر ممکن مدد کی تھی اور یہ سلسلہ تاحال جاری بھی ہے۔

حالیہ دنوں میں اچانک 5 لاکھ پناہ گزین یورپ کے دروازے پر جا پہنچے اور وہاں

پناہ حاصل کرنے کے لیے دستک دینے لگے۔ابتدائی دنوں میں یورپ نے ان پر پناہ لینے کے دروازے بند رکھے ۔ذرائع ابلاغ میں خبریں شائع ہونے لگی اقوام متحدہ کا دباؤ سامنے آیا۔ انسانی حقوق کی تنظیموں نے شور مچایا کہ انسان کی قدر کی جائے۔اس معاملے میں یورپ تقسیم ہوا۔ہنگری کے وزیر اعظم نے کہا کہ ہم اپنے ملک میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد نہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔برطانیہ بھی انہیں پناہ دینے سے ہچکچا رہا تھا۔سویڈن اور ڈنمارک کے عوام میں بھی تحفظات پائے جانے لگے۔اہل یورپ 5 لاکھ پناہ گزینوں کو دیکھ کر گھبرائے ضرور ہیں۔ پھر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جرمنی ان پناہ گزینوں کا ہمدرد بن کر سامنے آیا اور اس نے انہیں اپنے ہاں پناہ دینے کی اجازت دی۔اس کے بعد جرمنی سے ایسا تاثر آنے لگا کہ مسلم امہ ناکام ہو چکی ہے مسلمان در بدر کی ٹھوکریں کھا کر ہمارے ہاں ہی پناہ لینے پر مجبور ہیں۔جرمنی سے ایک بیان سامنے آیا کہ مسلمان حجازِ مقدس قریب ہونے کے باوجود ادھر چلے آئے ہیں ۔جرمنی اور یورپ کے دیگر ذرائع ابلاغ نے اسلام کی بے توقیری کی ایک مہم شروع کر دی اور کالموں،اداریوں اور تبصروں میں یہ تاثر دینا شروع کر دیا ہے کہ اسلام کا نظریہ اخوت ناکام ہو چکا ہے۔

مگر صورتِ حال اس سے مختلف ہے شام میں خانہ جنگی کا ذمہ دار امریکہ ہے اور یورپ اس کا اتحادی ہے۔اس خطے میں ان کے اپنے مفادات ہیں ۔11/9 کے بعد سے

امریکہ کی خواہش تھی کہ وہ پاکستان میں اپنے قدم جمائے اور فوجی اڈے قائم کرے مگر ایسا نہ ہو سکا۔امریکہ روس اور چین پر اپنا دباؤ برقرار رکھنے کے لیے اس خطے میں اپنی فوجی قوت قائم رکھنا چاہتا ہے۔اس نے شام میں اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے وہاں انتشار پھیلایا مگر تاحال بشارالاسد وہاں برسرِ اقتدار ہے۔امریکہ اپنے مقصد میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو پا رہا ہے۔وہ مسلمانوں میں انتشار اور بے چینی پھیلا کر یہاں اپنے مقاصد پورے کرنا چاہتا ہے۔ پناہ گزینوں کے کیمپوں کے ارد گرد فضائی حملوں نے شامیوں کو مزید خوف زدہ کر دیا اور انہیں ایک منصوبے کے تحت یورپ کی طرف ہجرت پر مجبور کیا گیا تاکہ وہاں افرادی قوت کی کمی کو پورا کیا جاسکے۔

اس سال کے آغاز پر یورپی کمیشن نے عمر رسیدگی کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی تھی اور جرمنی کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ 2060 میں وہاں عمر رسیدہ افراد کی تعداد فیصد ہو جائے گی۔نوجوان بتدریج کم ہو رہے ہیں جرمنی کی آبادی میں بھی کمی ہو 59 رہی ہے۔2060 تک ملک کی 59 فیصد آبادی کی پینشن ،علاج معالجہ اور ان کی دیکھ بھال پر اخراجات میں خطرناک حد تک اضافہ ہو جائے گا جبکہ کام کرنے والوں کی تعداد کم ہونے کی بدولت ٹیکس کی آمدن بھی کم ہو جائے گی۔برطانیہ کے سوا یورپ کے باقی ملکوں کو بھی کم و بیش ایسے ہی مسائل کا سامنا ہے یہی وجہ ہے کہ برطانیہ پناہ گزینوں کو اتنے بڑے پیمانے پر نہیں

لے رہا ہے۔ان پناہ گزینوں کی بدولت جرمنی میں کام کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو گا اور اس کی معیشت کو استحکام ملے گا۔یہ لوگ وہاں کے عمر رسیدہ افراد کو بھی پالنے میں اہم کردار ادا کرے گے۔دوسری طرف 40 لاکھ شامی بغیر کسی مفاد کے اسلامی ملکوں میں ہی پناہ گزیں ہیں۔اس سے قبل اتنے ہی افغان پناہ گزیں پاکستان میں مقیم رہے ہیں۔جرمنی کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مسلم امہ کا نظریہ اخوت کبھی بھی کمزور نہیں ہوا وہ آج بھی اسی جذبے ساتھ برقرار ہے جس جذبے کے ساتھ 14 سو سال قبل تھا۔جرمنی کو حقائق پوشیدہ رکھ کے مسلمانوں کے خلاف مہم چلانے سے گریز کرنا ہو گا اور اس کے نظریہ اخوت پر تنقید سے اجتناب کرنا ہو گا۔

سلامتی کونسل میں توسیع بھارت کا محض ایک خواب ہے

دنیا کی سب سے بڑی اور موثر تنظیم اقوامِ متحدہ UNO ہی ہے۔ تمام عالمی مسائل یہاں ہی زیرِ بحث لائے جاتے ہیں اور ان کے حل کی تدبیر بھی یہاں سے ہی کی جاتی ہے۔ دنیا کا ہر ملک اس تنظیم کا رکن ہے جنرل اسمبلی اس کا سب سے بڑا ذیلی ادارہ ہے مگر سلامتی کونسل اقوامِ متحدہ کا موثر ترین ذیلی ادارہ ہے۔ عالمی سیاست، معاملات اور امور میں اس کے پانچ مستقل ارکان کی اہمیت کلیدی نوعیت کی ہے۔ یہ پانچ مستقل ارکان ہر قسم کے عالمی امور اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ ان پانچ ملکوں نے باقی کی اقوامِ عالم کو یرغمال بنا رکھا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ پانچ عالمی طاقتیں بعض اوقات ناجائز کاموں کو بھی اپنے لامحدود اختیارات کی بدولت جائز قرار دیتی ہیں۔ 9/11 کے بعد عراق پر امریکی حملہ اس کی ایک بڑی مثال ہے۔ جن کیمیائی ہتھیاروں کا جواز بنایا گیا تھا وہ تاحال عراق سے ملے ہی نہیں ہیں۔ ان ملکوں کو حاصل ویٹو کی طاقت انہیں مزید مطلق العنان بنا دیتی ہے وہ اس طاقت کے ذریعے کسی بھی اکثریتی رائے کو باآسانی اور بغیر کسی دلیل کے بیان کیے مسترد کر سکتے ہیں۔

امریکہ، روس، چین، برطانیہ اور فرانس اس کے مستقل رکن ہیں۔ اب بھارت نے سلامتی

کونسل کا مستقل رکن بننے کی کوششیں تیز کر دیں ہیں ۔ ہندوستان گزشتہ تیس سالوں سے یہ نشست حاصل کرنے کی دعوے داری کر رہا ہے۔اس کا دعویٰ ہے کہ وہ گزشتہ بیس سالوں سے سلامتی کونسل کا مستقل رکن بننے کی ساری شرطیں پوری کرتا آ رہا ہے۔وہ اپنے آپ کو دنیا کی بڑی طاقت قرار دیتا ہے۔بقول اس کے وہ دنیا میں ہر سال سب سے زیادہ میڈیکل اور انجینیرنگ گریجویٹ پیدا کرنے والا ملک ہے امریکہ اور روس کے بعد وہ ہی خلائی ٹیکنالوجی میں مہارت رکھتا ہے اور خلا میں سب سے زیادہ سٹلائیٹ داغنے ولا بھی بھارت ہے۔جی ڈی پی کے اعتبار سے دنیا کی چوتھی بڑی معیشت ہے۔دنیا کا سب سے بڑا صارف بازار اور چوتھی بڑی فوج کا حامل ملک ہے چین کے بعد ایک ارب ستائیس کروڑ کی سب سے زیادہ آبادی اسی کی ہے۔بھارت کے ان دلائل کو دنیا تسلیم نہیں کرتی ہے۔سلامتی کونسل کے مستقل ارکان بھی بھارت کی اس رائے کو سنجیدگی سے نہیں لیتے ہیں بھارت کو بھی اس بات کا خوف ہے کہ چین اور روس اس کی قرارداد کو ویٹو کر دیں گے۔اسی خدشے کے پیشِ نظر اس سال 14 ستمبر کو سلامتی کونسل کی توسیع پر غور و خوض کے لیے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک مسودہ پیش کیا گیا ۔بھارت کا خیال ہے کہ سلامتی کونسل میں توسیع کا مسودہ جنرل اسمبلی کے اجلاس میں ووٹنگ کے لیے رکھا جائے گا جہاں وہ اسے دو تہائی اکثریت سے پاس کرانے کی کوشش کرے گا اگر ایسا ہو گیا تو مستقل رکن اسے ویٹو بھی نہیں کر سکیں گے۔

بھارت کی سلامتی کونسل کا مستقل رکن بننے کی خواہش اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک وہ اس کی بنیادی شرائط پوری نہیں کرتا ہے۔ وہ جن خوبیوں کا تذکرہ کرتا ہے درحقیقت وہ ان بنیادی خامیوں کے مقابلے بہت کم ہیں جو بھارت میں پائی جاتی ہیں ان ہی خامیوں کی بدولت بھارت سلامتی کونسل کا رکن نہیں بن سکتا ہے۔ سلامتی کونسل کا اور نیوکلرMTCR مستقل رکن بننے سے قبل بھارت کو میزائل ٹیکنالوجی کنٹرول رجیم پرNPT کا ممبر بننا ہوگا اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب وہNSG سپلائر گروپ دستخط کرے گا۔ بھارت ایٹمی ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے اس معاہدے پر دستخط کرنے سے انکاری ہے۔ یہ بات اس کے خطے میں توسیع پسندانہ عزائم کی عکاسی کرتی ہے۔ وہ ہمسایہ ممالک پر اپنی بلادستی قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ برصغیر کی تقسیم ابھی تک نامکمل ہے مسلہ کشمیر کے ساتھ جوناگڑھ کا معاملہ بھی قانونی طور پر حل طلب ہے اور برطانیہ اس نامکمل تقسیم کا ذمہ دار ہے۔ بھارت میں غربت کی بلند شرح اور انسانی حقوق کی پامالی اپنے عروج پر ہے۔ خالصتان کے قیام کے لیے 2020 میں ریفرنڈم کروانے کا سکھوں کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔ کیا بھارت یہ ریفرنڈم کروائے گا یا مسلہ کشمیر کی طرح اسے بھی دبائے رکھے گا؟ بھارت کو ابھی ایک منظم اور مکمل ریاست بننے میں کافی وقت درکار ہے اسے اپنے اندرونی اور خطے کے ممالک کے ساتھ درپیش مسائل اور تنازعات کو حل کرنا ہوگا

۔خلفشار کا شکار اور عالمی قوانین سے انحراف کرنے والی ریاست کسی طور بھی سلامتی کونسل کی مستقل رکن نہیں بن سکتی ہے۔بھارت کے لیے یہ نشست ایک ایسا خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی ہے۔

برصغیر کی نامکمل تقسیم۔۔برطانیہ ذمہ دار ہے

جنوبی ایشیا کا امن پاک بھارت تعلقات سے وابستہ ہے۔ان دونوں ملکوں کے تعلقات کی نوعیت اس خطے کے عوام پر اثرانداز ہوتی ہے۔ کئی ایک چھوٹی بڑی جنگیں ان دونوں ملکوں کے درمیان ہو چکی ہیں۔ سرحدی خلاف ورزیاں معمول بن چکی ہیں۔ اب دونوں ملک ایٹمی قوت کے حامل ہیں دونوں کو ہی اس قوت پر ناز ہے اور یہ اکثر اس قوت کے استعمال کی بات بھی کرتے رہتے ہیں۔ دونوں ملک ایک دوسرے پر دہشت گردی اور دراندازی کے الزامات بھی لگاتے رہتے ہیں۔ اس کشیدگی نے دونوں ملکوں کے 1.5 ارب سے زائد لوگوں کی زندگیوں کو نہ صرف داؤ پر لگا رکھا ہے بلکہ ان کے نصف سے زیادہ وسائل اسی کشیدگی کی نظر ہو رہے ہیں۔ ناخواندگی اور غربت کی بدولت اس خطے کے لوگ جرائم اور دہشت گردی کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں اور پھر عالمی امن کے لیے خطرہ بھی بن جاتے ہیں۔اس سارے مسلے کی بنیادی وجہ ان دو ملکوں کے درمیان پایا جانے ولا تنازعہِ کشمیر ہے۔

بظاہر یہ مسلہ دو ملکوں کے درمیان ہے مگر ایک تیسری قوت برطانیہ اس معاملے سے الگ تھلگ نظر آتی ہے اور یہ مسلہ اسی ملک کا پیدا کردہ ہے۔برطانیہ نے تقریباً سو سال برصغیر پر حکومت کی اور جاتے وقت اس خطے کو تقسیم کر کے

گئے۔اگر وہ یہ تقسیم مساویانہ اور اپنے ہی وضع کردہ اصولوں کے تحت دیانتداری کے ساتھ کرتے تو مسلہ کشمیر جنم ہی نہ لیتا اور اس خطے کے عوام پر سکون زندگیاں گزار رہے ہوتے۔ تاج برطانیہ نے ریاستوں کے عوام کے حقِ خود ارادیت کو فوقیت دی تھی مگر جلد ہی اپنے اس موقف کو اس نے پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ اس وقت کے کشمیر کے راجہ ہری سنگھ نے ایک دستاویز لکھ کر دی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ جموں و کشمیر کا الحاق بھارت کے ساتھ کر دیا جائے تو برطانیہ نے اسے فوری طور پر قبول کیا جبکہ دوسری طرف ریاست جوناگڑھ کے والی محبت خان نے بھی لکھ کر دیا تھا کہ ان کی ریاست کو پاکستان کے ساتھ شامل کیا جائے مگر یہاں تاج برطانیہ نے چشم پوشی سے کام لیا۔ شاہنواز بھٹو اس وقت اس ریاست کے وزیر اعظم تھے انہیں نے پاکستانی فوج سے مدد بھی مانگی تھی مگر بھارتی فوج نے اس سے پہلے ہی جوناگڑھ کا محاصرہ کر لیا تھا اور شاہ نواز بمشکل جان بچا کر پاکستان پہنچے تھے۔

1935 کے ایکٹ کے تحت تمام ریاستیں تاج برطانیہ کے ماتحت تھیں۔ان ریاستوں میں عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے ریفرنڈم کروانے کی ذمہ داری بھی تاج برطانیہ ہی کی تھی۔اگر اس وقت کے برطانوی راج کا یہ موقف تسلیم کر لیا جائے کہ دونوں ملکوں میں سے کسی بھی ملک کے ساتھ ریاست کے الحاق کے لیے اس کے والی کی رائے کافی ہے تو پھر محبت خان کی دستاویز کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا

اور جونا گڑھ کو پاکستان کے حوالے کرنا ہو گا۔ حکومتِ پاکستان نے کبھی بھی اس معاملے کو عالمی سطح پر اجاگر نہیں کیا ہے۔ بھارت دنیا کے سامنے یہ کہتا ہے کہ والیِ کشمیر نے بھارت کے ساتھ الحاق کیا تھا اور پاکستان نے اس اعلان کے بعد 1948 میں اپنی افواج کشمیر میں بھیجی تھیں۔ دنیا بھارت کے اس موقف کو درست تسلیم کرتی ہے۔ مسلہ کشمیر کسی صورت بھی فوجی انداز میں حل نہیں ہو سکتا ہے یہ صرف قانونی انداز میں ہی حل ہو سکتا ہے قائدِاعظم نے بھی پاکستان کا مقدمہ قانون کے دائرے کے اندر رہی رہ کر لڑا تھا۔ آج پاکستان کو ایک بار پھر قائد کے انداز میں ہی کشمیر کا مقدمہ لڑنا ہو گا۔ مسلہِ کشمیر کو عالمی فورمز میں جونا گڑھ کے ساتھ ملا کر پیش کرنا ہو گا۔ دنیا کو یہ باور کرانا ہو گا کہ برصغیر کی تقسیم تا حال نا مکمل ہے۔ برطانیہ کو اپنی ذمہ داری یاد کروانا ہو گی۔ پاکستان کو سفارت کاری کے ذریعے دنیا کے تمام ممالک کے سامنے اس مسلے کی بنیادی وجوہات کو اجاگر کرنا ہو گا۔ حکومت برطانیہ کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنے کراؤن کی عزت کا خیال رکھے۔ جو غلطی تاج برطانیہ سے ہوئی ہے اس کا ازالہ کرے۔ تاریخ میں اس خطے میں خلفشار کا ذمہ دار برطانیہ ہی تصور ہوتا ہے۔ آزادی، مساوات اور انصاف کے علمبردار اس ملک کی اس سنگین غلطی کو تاریخ کے اوراق میں نظر انداز کرنا نا ممکن ہے۔ دنیا کی قدیم ترین جمہوریت کے حامل اس ملک کو اپنے اوپر لگے اس داغ کو صاف کرنا ہو گا۔ برصغیر کی تقسیم کو مکمل کرنے کے لیے برطانیہ کو نہ صرف عالمی سطح پر اپنا کردار ادا کرنا

ہو گا بلکہ بھارت پر بھی ان مسائل کو حل کرنے کے لیے دباؤ ڈالنا ہو گا۔ یہ خطہ امن کی منزل اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب اس کی تقسیم کا عمل مکمل ہو گا۔

نئی عالمی صف بندی اور پاکستان

ان سالوں میں عالمی سیاست میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ پچھلی صدی میں دو عالمی جنگیں اور پھر USSR کا خاتمہ ہوا۔امریکہ تنہاء طاقت کا مرکز بن کر ابھرا۔امریکہ کی پوری دنیا میں اجارہ داری کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔ نئی صدی نئے انداز میں شروع ہوئی اور 11/9 کا واقعہ رونما ہوا۔اس واقعہ نے سفارتی محاذ پر جنگ کے انداز بدل ڈالے ہیں۔ نئی صف بندیاں ہوئیں۔دوست دشمن اور دشمن دوست بننے لگے۔مفادات کا تعین از سر نو کیا جانے لگا۔

امریکہ نے تنہاء عراق،افغانستان ،لیبیا، مصر میں تباہی پھیلائی اور ان ملکوں میں حکمرانوں کو تبدیل کیا۔شام میں شورش بپا کی۔ اس نے ان علاقوں کے وسائل کو لوٹا اور جن وسائل کو لوٹ نہ سکا انہیں بے دردی سے تباہ کیا۔مشرق اور مغرب میں خلیج گہری ہوئی لوگوں میں تعصب اور نفرت کے جذبات کو فروغ ملا۔امریکہ اور اس کے یورپی اتحادیوں نے ان علاقوں میں ایسی تباہی پھیلائی کہ جس کے اثرات صدیوں تک رہیں گے۔

اس طرف چین نے امریکہ کی پیش قدمی کو روکنے کی غیر فوجی کوشش کی ہے اقتصادی

میدان میں اس کا مقابلہ بھی کیا مگر وہ امریکہ کے خطے میں اثر رسوخ کو کم نہ کر سکا ۔بھارت نے بھی سلامتی کونسل کی مستقل نشست کے لیے بھرپور لابنگ کی دنیا کو باور کروانے کی کوشش کی کہ وہ اس طرف تنہا سپر پاور ہے مگر امریکہ اور یورپ نے اس کی اس بات کو بھی رد کر دیا۔یہی بھارت نیوکلر میدان میں امریکہ کا اتحادی بنا ہوا ہے۔اور اب مکمل طور پر اسی کے بلاک میں شامل ہے اور اس کے زیرِ نگیں ہے۔ایران نے ہمیشہ امریکہ کو للکارا ہے ایٹمی پروگرام پر معاہدے کے باوجود وہ امریکہ کی اجارہ داری کو قبول کرنے سے گریزاں ہے۔شام میں بشار الاسد امریکہ کے خلاف برسرِپیکار ہے امریکہ کی لاکھ کوشش کے باوجود اس کا اقتدار قائم ہے ایران کی بھرپور فوجی اور سفارتی مدد اس کے ساتھ رہی ہے۔

اس سارے منظر نامے میں روس کے کردار کو اب نظر انداز کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔افغان وار میں امریکہ سے شکست کے بعد اس نے اب اپنے آپ کو منظم کیا ہے اور پھر سے خطے میں بھرپور کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا ہے وہ امریکہ کی یہاں موجودگی کو کبھی بھی تسلیم نہیں کرتا ہے گزشتہ چند سالوں سے اس نے خطے کے ممالک کے ساتھ اپنے تعلقات کو از سرِ نو مرتب کیا ہے۔ایران اور شام کو مکمل سپورٹ کرتا رہا ہے ۔سلامتی کونسل میں ان کے خلاف پیش ہونے والی قراردادوں کو مسترد کرتا رہا ہے۔پاکستان کے ساتھ مختلف نوعیت کے معاہدے کر

کے اس بھی اپنے قریب کر لیا ہے۔

روس نے اب بشار الاسد کی فوجی مدد بھی شروع کر رکھی ہے داعش اور باغیوں پر فضائی حملوں کے بعد وہ اب اپنی زمینی فوج بھی شام روانہ کر رہا ہے یہ چیز امریکہ کے لیے کسی بڑے خطرے کا سبب بن سکتی ہے جب دو بڑی طاقتوں کے مفادات کے ساتھ ساتھ فوجیں بھی ٹکرائیں گی تو اس خطے میں شدید تباہی اور بربادی پھیلے گی۔شاہد روس نے اب یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ امریکہ کو مزید یہاں نہیں رہنے دے گا۔روس جو جنگ امریکہ سے افغانستان میں ہارا تھا اب وہ اسی کا بدلہ شام کے میدان میں لینا چاہتا ہے۔روس کو ایران اور کسی حد تک چین کی حمایت بھی حاصل ہے۔جب ایک خطے میں دو بڑی طاقتیں آمنے سامنے ہوتی ہیں تو اس خطے کے دیگر ممالک میں بھی اس کے اثرات دیکھے جاتے ہیں۔ایران کی مدد سے یمن میں حوثی قبائل پھر سے پیش قدمی کر رہے ہیں۔سعودی عرب کے اندر ہلچل موجود ہے۔اس خطے میں کچھ ملکوں کا جغرافیہ اور حکومتیں تبدیل ہونے کے امکانات بھی موجود ہیں۔

اس تمام تر نئی صف بندی میں پاکستان کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔اس منظر نامے میں اس کا کردار بنیادی اور کلیدی نوعیت کا ہے۔دونوں بڑی طاقتوں کی کامیابی کا انحصار پاکستان کے کردار پر ہے۔اگرچہ کہ پاکستان کا اب جھکاؤ

روس کی جانب ہے مگر اسے پھر بھی اپنے کردار کو از سر نو منظم کرنا ہو گا۔ کسی کا فریق بننے کی بجائے مصالحت کی راہ اپنانا ہو گی۔ دہشت گردی کے خلاف طویل جنگ لڑنے کے بعد پاکستانی فوج اب ایک منظم اور جنگجو فوج کے روپ میں سامنے آئی ہے اس کی صلاحیتوں سے سب واقف ہیں۔بڑی طاقتیں اور خطے کے ممالک اس کی فوج سے استفادہ کرنے کے خواں ہیں۔پاکستانی فوج تحفظ کی ضمانت بن چکی ہے لہٰذا اپنی اہمیت کو سمجھتے ہوئے پاکستان کو اس تمام تر صورتحال میں فریق بننے کی بجائے مصالحت کار بننا ہو گا اور اس خطے کے عوام کو کسی بھی جنگ کی آگ سے بچانا ہو گا اگر پاکستان ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو تاریخ میں اس کا نام سنہری حروف میں چمکتا رہے گا۔

عالمی دہشت گردی اور اسلحہ سازی کا کاروبار

13 نومبر کو فرانس میں ہونے والے حملوں کے بعد جو ردِ عمل سامنے آیا ہے اس نے 9/11 کی یاد تازہ کر دی ہے۔ فرانس میں ہونے والے حملے بلاشبہ قابلِ مذمت ہیں۔ دہشت گردی کسی بھی جگہ اور کسی کے بھی خلاف ہو اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جا سکتی ہے۔ انسانی جان کی قیمت ہر شے سے زیادہ ہے۔ بے گناہوں کی ہلاکت پر خدا کبھی راضی نہیں ہوتا ہے۔ انسان کے ذریعے انسان کا خون گرے تو انسانیت کی تذلیل ضرور ہو گی۔ انسانی تاریخ میں ظالموں کے لیے سوائے لعنت کے کوئی اور تعریف موجود نہیں ہے۔ ظلم ہر دور اور ہر حال میں قابلِ نفرت و لعنت رہا ہے۔ ان حملوں کے بعد مختلف سطحوں سے جو ردِ عمل سامنے آیا ہے وہ حوصلہ افزاء نہیں ہے۔ الزام تراشی اور مفاقاتِ عمل کے دروس نے عام انسان کو مایوس کیا ہے۔ ان حملوں کے بعد مشرق اور مغرب کے درمیان تقسیم کی لکیر مزید گہری ہوئی ہے۔ پوری دنیا کے لیے گلوبل ولیج کا تصور تار تار ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ تہذیبوں میں فاصلے بڑھنا شروع ہو گے ہیں اور اس ردِ عمل کی بدولت دنیا میں تصادم بڑھتا ہوا دیکھائی دے رہا ہے۔ عالمی رہنماؤں نے ذمہ داری اور سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ان حملوں کی ذمہ داری داعش نے قبول کی ہے اور امریکہ و یورپ نے اس تنظیم کو صفحِ ہستی سے مٹانے کا عزم کیا ہے۔ فرانس اور امریکہ نے شام پر فضائی حملے

تیز کر دیے ہیں۔ان حملوں میں اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ ہلاک ہونے والے تمام افراد دہشت گرد ہی ہوں گے۔ان حملوں میں عام افراد کی ہلاکتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔

9/11 کے واقعہ کے بعد امریکہ اور یورپ نے نیٹو کے پرچم تلے مسلمان ملکوں میں جو تباہی پھیلائی ہے اس کے زخم ابھی تک تازہ ہیں القائدہ کا اب کوئی نام لیوا نہیں رہا مگر اس کی جگہ داعش نے لے لی ہے۔داعش نے جس تیزی سے اپنا اثر دیکھایا ہے وہ کسی بھی سپر طاقت کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔یہ طاقت مشرق کی ہو یا مغرب کی البتہ یہ بات طے ہے کہ کسی ریاست کی مرضی کے بغیر داعش اتنی طاقت ور نہیں ہو سکتی ہے۔ایسے میں اقوامِ متحدہ کا کردار مایوس کن رہا ہے وہ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں غافل رہا ہے۔حکومتوں اور ریاستوں کی سازشوں کو یہ ادارہ بھانپ ہی نہیں سکا۔یہی وجہ ہے کہ آج دنیا بھر میں دہشت گردی اپنے عروج پر ہے۔چند عالمی رہنماؤں نے پوری دنیا کو دھوکے میں رکھا ہوا ہے دہشت گردی کے خلاف جنگ کی آڑ میں وہ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کر رہے ہیں۔فرانس حملوں کے بعد اس بات پر ضرور غور ہونا چاہیے کہ دہشت گردی کو فروغ کیوں کر مل رہا ہے؟ اس کے محرکات کیا ہیں؟ عام طور پر اور اب فرانس حملوں کے بعد سے مسلمانوں کو زیادہ موردِ الزام ٹھہرایا جانے لگا ہے۔کوئی اسے مذہبی تضادات کا نتیجہ قرار دیتا ہے مگر یہ اقوامِ متحدہ کا

فرض ہے کہ وہ اس بات کی تحقیقات کرے کہ کن عوامل کی بدولت دہشت گردی بڑھ رہی ہے۔

وسائل کی غیر مساویانہ تقسیم اور ترقی پذیر ملکوں میں تعلیم کے فروغ میں رکاوٹیں مختلف تہذیبوں اور معاشروں کے درمیان خلیج بڑھا دیتی ہیں۔ان ملکوں کا احتساب ہونا چاہیے جنہوں نے عالمی وسائل پر ناحق قبضہ کر رکھا ہے یا انہیں لوٹا ہے۔ تعلیم کے فروغ سے غفلت برتنے والوں کو بھی کٹہرے میں لانا ہو گا۔اس سب سے بڑھ کر عالمی ادارے کو اس بات پر بھی تحقیقات کرنا ہوں گی کہ دنیا بھر میں اسلحے کے کاروبار میں کون کون فائدہ اٹھا رہا ہے۔یورپ اور امریکہ کی اسلحہ کی صنعت نے گزشتہ 25 سالوں میں بے پناہ ترقی کی ہے اس صنعت میں وہاں کے حکمرانوں یا ان کی لابی کرنے والوں کے شئیرز ہیں انہیں لوگوں نے دولت کمائی ہے۔ اسلحہ کے تاجر اسی وقت خوشحال ہوں گے جب ان کا اسلحہ بکے گا۔اسلحہ کی مارکیٹ میدان جنگ ہی ہوا کرتی ہے۔دنیا میں جتنا انتشار ہو گا بدامنی پھیلے گی قتل وغارت بڑھے گی اتنا ہی اسلحہ کی طلب میں اضافہ ہو گا۔سیاست ہمیشہ بے رحم ہوتی ہے حکمران مفادات کے لیے کسی بھی حد کو عبور کر سکتے ہیں وہ اپنے اسلحہ کی کھپت کے لیے دنیا بھر کو میدان جنگ بنا سکتے ہیں۔انتشار کی صورت میں ریاست اور غیر ریاستی عناصر دونوں کو اسلحہ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ مفاد پرست ان کی ضرورتوں کو منہ مانگے داموں پورا

کرتے ہیں۔ لہٰذا اقوامِ متحدہ کا یہ فرض ہے کہ وہ ایک تحقیقاتی کمیشن بنائے اور وہ ان انسانی خون کے تاجروں کے منہ سے نقاب اتارے اور دنیا جان سکے کہ اصل دہشت گرد کون ہے۔

عالمی دہشگردی کے خاتمہ میں پاکستان کا ممکنہ کردار

موجودہ دور میں دہشتگردی علاقائی مسلہ نہیں رہا بلکہ یہ اب عالمی مسلہ بن چکا ہے۔اس سے قبل دنیا اس مسلے کو ایک مخصوص علاقے یا خطے کا مسلہ سمجھ کر مکمل سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کر رہی تھی۔عمومی خیال یہی تھا کہ ایک خاص خطے کا یہ مسلہ اسی جگہ تک محدور رہے گا۔مگر حالیہ فرانس حملوں کے بعد دنیا کی آنکھیں کھلی ہیں اور اب یورپ اور وہاں کا کلیسا بھی اسے عالمی مسلہ قرار دیتا ہے۔فرانس ،بیلجیم،برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک میں ہائی الرٹ اور دہشت گردوں کو تلاش کرنے کے لیے فورسز کے چھاپوں نے وہاں کے باسیوں کو پریشان کرکے رکھ دیا ہے۔بڑی قوتوں کا سابقہ کردار کیا تھا اس کے برعکس اب تمام دنیا کو یکجا ہو کر اس مسلے کے خاتمے کے لیے سوچنا ہو گا اور اس طریقہ کار کے بارے میں سوچنا ہو گا جس کو اپنا کر اس ناسور کو جڑ سے اکھاڑا جا سکتا ہے۔

عالمی دہشت گردی کا پہلا شکار ملک پاکستان ہی ہے۔ 11/9 کے بعد امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے چند اسلامی ملکوں پر یلغار کر دی تھی۔ایسے میں پاکستان کی مشکلات میں اضافہ ہوا۔دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان نے امریکہ کا

ساتھ دینے کا فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں اس ملک کے اندر بیرونی شدت پسندوں نے داخلی سہولت کاروں کے ساتھ مل دہشت گردی کی کاروائیوں کا آغاز کر دیا۔یہ کاروائیاں جلد ہی اتنی شدت اختیار کر گئی تھی کہ اس نے ملکی سلامتی کی بنیادوں کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔کیونکہ فوج ہی ملکی سلامتی کے دفاع کا پہلا زینہ ہوتی ہے تو اس نے اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اس جنگ کو لڑنے کے لیے تمام تر امور اور فیصلوں کے اختیار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جس کی حکومتوں اور عوام نے تائید بھی کی۔

موجودہ دہشت گردی کا انداز انتہائی مشکل اور خطرناک ہے۔اس طرز کی جنگ میں دشمن آپ کے اندر ہی موجود ہوتا ہے اس کی شناخت کرنا کئی مرتبہ ناممکن ہو جاتا ہے۔دشمن دفاعی تنصیبات اور فوج کو نشانہ بنانے سے پہلے عام لوگوں پر خود کش اور جان لیوا حملے کرتا ہے ان میں اس قدر شدت ہوتی ہے کہ پوری قوم اور اس کے اداروں کا مورال گر جاتا ہے۔ایسے میں دہشت گرد کو تلاش کرنا اور پھر اسے ختم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔مگر پاکستان فوج اور قومی سلامتی کے دیگر اداروں نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کیا۔تربیت کے نظام کو بہتر بنایا۔اتحادیوں سے جدید ٹیکنالوجی حاصل کی اور ایک مشن کے طور پر اس جنگ کا منظم طور پر آغاز کیا۔آج پاکستانی فوج اپنے اور عوام کے اندر چھپے خطرناک دہشت گردوں کو شناخت بھی کر سکتی ہے اور مزید ان کے سہولت

کاروں کو بھی بے نقاب کرنے کی صلاحیت حاصل کر چکی ہے۔اگرچہ کہ اس جنگ میں اسلحہ اور ٹیکنالوجی کی مد میں عالمی تعاون بھی حاصل رہا ہے مگر اس سے پہلے اس جنگ میں کام آنے کے لیے اپنا سینہ اسی فوج کے جوانوں نے پیش کیا۔پاکستانی فوج نے یہ جدید طرز کی جنگ خطرناک ترین جنگلوں اور پہاڑوں میں ہر طرح کے موسموں کی شدت میں بھی لڑی ہے اور پر ہجوم آبادیوں میں بھی دہشت گردوں کا صفایا کیا ہے۔ تجربہ، صلاحیت، پیشہ ورانہ امور اور جذبہ کے ہوتے ہوئے پاکستانی فوج اب اس طرز کی کامیاب جنگ لڑنے والی دنیا کی واحد فوج بن چکی ہے۔اب پاکستان میں بحال ہوتے ہوئے امن نے پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔

جنرل راحیل شریف کا حالیہ دورہِ امریکہ اسی پس منظر میں تھا۔دنیا پاکستانی فوج کی صلاحیتوں کو تسلیم کر چکی ہے اور وہ اب اس کے تجربات سے استفادہ کرنا چاہتی ہے۔یہ محض اتفاق ہے کہ پاکستانی جنرل کے دورے سے ایک روز قبل ہی فرانس میں دہشت گردی کا واقعہ رونما ہوا۔اس واقعہ نے اس دورے کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا۔امریکہ میں جنرل کی ملاقاتوں اور مصروفیات نے بہت کچھ واضح کر دیا ہے۔یورپ اور امریکہ اب اس جنگ کو سنجیدگی سے لڑنے کی بات کر رہے ہیں نیٹو فورسز کے ہوتے ہوئے بھی G20 وہ اب G20 کے پلیٹ فارم سے اس جنگ کے لیے وسائل اور فوج حاصل کرنا چاہتے گروپ کا ممبر نہیں ہے مگر یہ ہیں پاکستان اس

ممالک اس جنگ کی قیادت کے لیے پاکستان کی ہی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وہ اس کی فوج کے تجربے، صلاحیت، پیشہ ورانہ امور اور جذبے سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ کہ یہ بات قبل از وقت ہے پر عین ممکن ہے کہ جنرل راحیل شریف کو ہی اس نئی عالمی فوج کی قیادت کرنے کا کہا جائے جو عنقریب دہشت گردی کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے میدان میں اترنے والی ہے۔

کیا امن قائم کرنے کے لیے جنگ ضروری ہے؟

اس وقت دنیا کو امن کی جتنی ضرورت ہے شاہد اس سے قبل کبھی بھی نہ ہو۔آج انسانی تاریخ میں سب سے بڑی تباہی پھیلانے والے ایٹمی اور کیمیاوی ہتھیار موجود ہیں۔ میدان جنگ یا سفارتی محاذ پر بھی تھوڑی سی انسانی غفلت یا عجلت دنیا میں بہت بڑی تباہی پھیلا سکتی ہے۔عالمی منظر نامے میں تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اس دنیا کو کسی بڑی جنگ کی طرف لے کر جا رہے ہیں۔بڑی اور ذمہ دار قوتیں میدانِ حرب سجا کر ہی امن کا گیت گانے پر تُلی ہوئی ہیں۔ہر طرف دہشت گردی کا شور بلند ہے کیا اس کو ختم کرنے کے لیے بھی کسی دہشت گردی کی ضرورت ہے؟ یہاں اس سارے منظر نامے میں مقاصد اور عزائم کچھ اور ہیں۔دنیا میں اس وقت سرمایہ دارانہ نظام اپنی جڑیں مضبوط کر چکا ہے اور اس نے پوری طرح ہر معاشرے پر اپنے پنجے گاڑ لیے ہیں۔مگر باوجود اس کے یہ نظام اب بھی روس سے ڈرتا ہے۔دوسری طرف روس بھی امریکہ کو پوری دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنے سے باز رکھنے کے لیے کوششیں کر رہا ہے۔اس مقصد کے لیے وہ شام میں ایک آخری معرکہ میں اترنے کا ارادہ بھی رکھتا ہے۔

روس اور افغان جنگ کے اختتام پر امریکہ کو دنیا کے تمام ممالک پر اپنا اثر

قائم کرنے میں آسانی میسر آئی اور اس نے اپنے توسیع پسندانہ عزائم کو پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ روسی بلاک میں شامل تمام ممالک کو ایک ایک کرکے تباہ کیا اور وہاں پر حکومتوں کو بھی تبدیل کیا۔ اس بلاک کا آخری ملک شام ہے جو امریکہ کے مقابلے میں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔ بشار الاسد علوی ہے اور یہ گروہ شام میں صرف 4 فیصد آبادی پر مشتمل ہے۔ امریکہ کی پوری کوشش ہے کہ اسد کو منظر نامے سے ہٹا دیا جائے۔ امریکہ کا خیال تھا کہ چار فیصد آبادی کا حمایت یافتہ بشار الاسد زیادہ دیر اقتدار میں نہیں رہ سکے گا مگر گزشتہ چار سالوں سے وہ اپنے اقتدار کو نہ صرف قائم رکھ سکا ہے بلکہ اب وہ مزید طاقت ور ہوا ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ ملک کے اندر بشار الاسد کی حمایت اس قدر نہیں ہے جس قدر اقتدار میں رہنے کے لیے ضروری ہوا کرتی ہے مگر بیرونی عوامل نے اس کے اقتدار کو قائم رکھا ہوا ہے۔ روس اس کا سب سے بڑا حمایتی ہے۔ اس کی فوج وہاں پر موجود ہے۔ ایران اور لبنانی حزب اللہ بھی اسد کے ساتھ ہیں۔ اب پاکستان سے جانے والے پاراچنار کے کچھ افراد کی وہاں موجودگی کی بھی اطلاعات آئی ہیں۔ پاراچنار میں ہونے ولا حالیہ بم دھماکہ اسی کا ردِ عمل ہے۔ امریکہ ہمیشہ دہشت گرد گروپس کو آپس میں لڑاتا ہے اور پھر اپنے مفادات حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ داعش سمیت مختلف گروہ کی مدد سے اسد حکومت کا خاتمہ چاہتا ہے اور وہ اس انتظار میں ہے کہ داعش شام حکومت کا خاتمہ کرے اور پھر وہ وہاں اپنا کنٹرول حاصل کرے۔

ملک شام میں صورتِ حال تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے۔روس جو اس سے قبل شام کے معاملے پر قدرے خاموش تھا اب کافی متحرک ہوا ہے۔ترکی کے ساتھ اس کی نوک جھونک بھی معنی خیز ہے۔امریکہ ترکی کی پشت پناہی کرتا ہے اور ترکی امریکہ کی ہی خواہش پر روس کو للکارتا ہے۔دونوں ممالک میں تناؤ خطے لیے خطرناک ہو گا۔روس کی پوری کوشش ہے کہ امریکہ کو یہاں پر ہی روکا جائے۔ایران اور خطے کے دیگر شیعہ گروہ بھی اس کے ساتھ ہیں۔یمن میں جنگ کی آگ مزید تپ رہی ہے۔ہر کسی کو کسی نہ کسی سے خطرہ لاحق ہے اپنی جان بچانے کے لیے دوسرے کی جان لینا لازمی سمجھا جانے لگا ہے۔اپنے ملک میں امن قائم کرنے کے لیے دوسرے ملک میں بد امنی ضروری تصور کی جاتی ہے۔جنگ کو ختم کرنے کی بجائے اس کی وسعت میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔اب 34 اسلامی ملکوں نے سعودی عرب کی قیادت میں ایک مشترکہ فوجی اتحاد تشکیل دیا ہے۔پاکستان بھی اس اتحاد میں شامل ہے جب کہ ایران اس اتحاد کا حصہ نہیں ہے۔یمن میں بھی سعودی عرب کی فوجی کاروائیوں میں تیزی آئی ہے اس اتحاد کے قیام سے اس کی فوج کا بھی حوصلہ بڑھا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کی اس جنگ میں مسلمانوں کو بطور ایندھن استعمال کیا جانے ولا ہے۔روس اپنے آخری معرکے میں شام اور ایران سمیت دنیائے اسلام کے کئی غیر ریاستی عناصر کو اور امریکہ باقی مسلمان ممالک کے

زیرِ استعمال لانا چاہتا ہے۔ عالم اسلام کو اس بات پر ضرور غور کرنا ہوگا کہ کیا امن کے قیام کے لیے اس کا میدانِ جنگ سجانا ضروری ہے؟ اور کیا اغیار کے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال ہونا خود ان کے لیے سود مند ہے؟ مسلم قیادت کو انتہائی تدبر اور فہم سے کام لینا ہوگا اور جنگ سے اجتناب کرتے ہوئے مذاکرات اور مباحثے کے ذریعے امن کی منزل کو حاصل کرنا ہوگا۔

مسلمان پھر سازش کا شکار ہیں

جمہوری اسلامی ایران جنوب مغربی ایشیا کا ایک ملک ہے جو مشرقِ وسطیٰ میں واقع ہے۔ایران کے مشرق میں پاکستان اور افغانستان واقع ہے۔مغرب میں اس کی سرحدیں ترکی اور عراق سے ملتی ہیں۔شمال میں آرمینیا،آذربائیجان اور ترکمانستان واقع ہیں۔ایران کے جنوب میں خلیج فارس اور خلیج اومان ہیں۔اس کا سرکاری مذہب شیعہ اسلام ہے اور سرکاری زبان فارسی ہے۔ایران دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک ہے۔اس ملک کی تاریخ ہزاروں سالوں پر محیط ہے۔مذہبی طور پر یہ لوگ آتش پرست تھے۔651ء کے لگ بھگ مسلمانوں نے ایران کو فتح کیا۔15ویں صدی تک یہاں کے لوگ سنی اسلام کے پیروکار تھے۔اس کے بعد یہاں صفوی حکومت قائم ہوئی جس نے 16 صدی میں اثنا عشری شیعہ مسلک کو فروغ دیا اور یوں وہاں کی تقریباً تمام آبادی نے اسی مسلک کو اختیار کر لیا۔اب ایران کی 90 فیصد آبادی شیعہ اسلام کی پیروکار ہے 8 فیصد سنی مسلمان ہیں جبکہ 2 فیصد دیگر مذاہب کے لوگ ہیں۔
ایران میں ابتداء سے ہی بادشاہت قائم تھی اور اس کا اختتام 1979 کے اسلامی انقلاب پر ہوا۔انقلاب سے قبل ایران ایک لبرل ملک تھا۔رضا شاہ پہلوی اس کا مطلق العنان حکمران تھا۔یہ ملک یورپ اور امریکہ کی آنکھ کا تارا تھا۔اسلامی

ممالک میں بھی اس کا کردار مثبت تھا۔انقلاب سے قبل ایران کے ساتھ پاکستان کے تعلقات بھی مثالی تھے۔پاکستان کو سب سے پہلے تسلیم کرنے سے لے کر آ۔ر سی۔ڈی نامی تنظیم تک دنوں ملک ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔پاک بھارت جنگوں میں بھی ایران نے پاکستان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔اس کے علاوہ خطے کے دیگر اسلامی ممالک کے ساتھ بھی ایران ایک پرسکون ماحول میں رہ رہا تھا اس کی خارجہ پالیسی سے کسی کو کوئی خاص شکایت نہ تھی۔

70 کی دہائی میں امریکہ جب افغانستان میں روس کے ساتھ الجھنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا تو اس خطے کے ممالک کے تمام تر حالات اس کے پیش نظر تھے۔وہ مسلمانوں کو فرقہ واریت میں الجھا کر روس کے خلاف ایک منظم افرادی قوت اکٹھی کرنا چاہ رہا تھا۔یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا تھا جب یہاں کے مسلمانوں میں ایک کھچاؤ پیدا ہو۔اس نے سنی شعیہ کی تفریق کو بھرپور ہوا دی۔سعودی عرب سے تعلقات استوار کیے وہاں کی مخصوص سوچ کو پروان چڑھایا اور اس کے ذریعے افرادی قوت حاصل کی۔یہ بات بھی باعثِ حیرت ہے کہ امریکہ اور یورپ کی بظاہر شدید ترین مخالفت کے باوجود فرانس نے امام خمینی کو اپنے ہاں پناہ دی اور انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے لیے اپنی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت دی۔ایرانی انقلاب کی اس تحریک میں فرانس کا کردار ایک سہولت کار کا تھا۔امریکہ کو سعودی عرب کے مقابلے میں ایک شدت پسند اسلامی حکومت کی بھی

ضرورت تھی جسے ایران نے پورا کیا۔ بدقسمتی سے اس وقت مسلم حکمران اس امریکی چال یا سازش کو نہ بھانپ سکے اور اس کا شکار ہو گئے اور یوں مسلمانوں میں فرقہ وارانہ کشیدگی کا آغاز ہو گیا۔ ایران اور سعودی عرب کی چپقلش انہیں دنوں سے ہے۔ یہ دونوں ملک پراکسی وار کا شکار ہوئے اور انہوں نے افغانستان، عراق اور پاکستان کو اپنا میدانِ جنگ بنایا۔ اس پراکسی وار نے امریکہ کو اس خطے میں قدم جمانے کا موقع فراہم کیا۔

اب ایک بار پھر امریکہ وہی چال دوبارہ چل رہا ہے۔ اب اس کا منظورِ نظر ایران ہے۔ اس پر اقتصادی پابندیاں بھی ختم ہو چکی ہیں دولت کی فراوانی ہونے کو ہے۔ اب ایران اپنے نظریے اور مسلک کا فروغ چاہتا ہے بحرین، یمن، کویت سعودی عرب پاکستان، افغانستان میں شیعہ تحریکیں قدم اٹھا رہی ہیں۔ مسلح جدوجہد ہوتی بھی نظر آ رہی ہے۔ جو کام سعودی سوچ کے حامل لوگ گزشتہ سالوں میں کرتے رہے ہیں اب ایرانی سوچ کے حامل لوگ وہی کام کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ دونوں ملکوں میں پراکسی وار کی حدت تیز ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اس طرح کی جنگ میں میدان دوسرے ممالک ہی بنا کرتے ہیں۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ دونوں ممالک دانشمندی کا مظاہرہ کریں۔ امریکہ اور یورپ کی سازشوں کا بار بار شکار ہونے کی بجائے آپس میں براہِ راست رابطہ قائم کریں اسلامی اقدار، روایات اور تعلیمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کشت و

خون سے پرہیز کریں۔ مسلمان حکمرانوں کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ وہ یومِ حساب
اپنے عمال، افکار اور نظریات کے بارے میں حق کے سامنے بھی جوابدہ ہوں گے۔

ریاست کی از سرِ نو تعریف کی ضرورت

قدیم یونانی فلسفے کے مطابق تین عناصر علاقہ، آبادی اور حکومت مل کر ایک ریاست تشکیل دیتے ہیں۔ موجودہ دور میں دنیا کی تمام ریاستیں اسی تعریف کے تحت قائم ہیں ۔اقوامِ متحدہ کا ادارہ بھی اسی تعریف کو تسلیم کرتا ہے۔ہر ریاست کے اپنے تقاضے اور ترجیحات ہوا کرتی ہیں۔اس کی اپنی تاریخ، تمدن، ثقافت اور ایک فکر ہوا کرتی ہے۔اسی کے پیشِ نظر وہ اپنی خارجہ، دفاع اور معاشی پالیسی ترتیب دیتی ہے۔ فلسفیوں کے مطابق ریاست صرف اپنے عوام کی فلاح کے لیے کام کرتی ہے۔اپنے وسائل کو منصفانہ انداز میں اپنے عوام میں تقسیم کرتی ہے۔اس کا کسی دوسری ریاست کے ساتھ کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے مگر تاریخ میں ریاست کا تصور اس کے برعکس ابھر کر سامنے آیا ہے۔ اپنے عوام کی فلاح کے نام پر دوسری ریاستوں کے وسائل کو لوٹ کر اپنے ہاں لایا گیااور اس مقصد کے لیے ریاستوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو وسعت دی اپنی ثقافت اور فکر کو دوسروں پر مسلط کیا جس کے نتیجے میں بڑی جنگیں ہوئیں اور انسانی جانیں اور وسائل ضائع ہوئے۔ گزشتہ صدی میں اقوامِ متحدہ کے قیام سے اس توسیع پسندانہ سوچ میں کچھ رکاوٹ پیش آئی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ منظم عسکری طریقہ کار کی جگہ کچھ اور ذرائع نے لے لی ہے۔

اس قدیم تصورِ ریاست کے مطابق کوئی بھی ریاست اپنے علاقے ،آبادی اور حکومت پر بیرونی مداخلت برداشت نہیں کرتی ہے اور نہ ہی کسی دوسری ریاست کو اپنی ثقافت معیشت اور فکر کو تبدیل کرنے کی اجازت دے سکتی ہے۔تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے، تو ہر ریاست نے اپنے عوام کو دوسری ریاست کے عوام سے ڈرایا ہے۔ریاست کے حکمرانوں نے خوف کی فضاء پیدا کرکے فلاحی تصور ریاست کو بدل کر اسے سیکورٹی سٹیٹ میں بدل دیا ہے۔ہر ریاست دوسری ریاست کو کمزور کرکے ہی خود کو محفوظ سمجھنے لگی۔بڑی اور طاقت ور ریاستوں نے چھوٹی اور کمزور ریاستوں کے معاملات میں مداخلت کرکے عالمی امن کو تباہ کرکے رکھ دیا ہے۔

گلوبلائزیشن کا تصور سامنے آنے کے بعد ریاست کے اندر بیرونی مداخلت روکنا اب کسی کے بس کی بات نہیں رہی ہے۔انفارمیشن ٹیکنالوجی ملکی سرحدوں کی متحاج نہیں ہوتی ہے۔اب کوئی بھی ریاست باآسانی دوسری ریاست کے عوام کے ذہنوں پر اس ٹیکنالوجی کے ذریعے اثر انداز ہو سکتی ہے۔وہ اپنے حامی باآسانی دوسری ریاست میں پیدا کر لیتی ہے۔پھر انہیں حامیوں کے ذریعے مسلح گروہ تشکیل دے کر مخالف ریاست کو کمزور کیا جاتا ہے۔انہیں مسلح گروہوں کے لیے نان سٹیٹ ایکٹر کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔یہ بات طے ہے کہ غیر ریاستی گروہ کی سرپرستی ایک ریاست ہی کرتی ہے۔القائدہ،طالبان،داعش،بوکوحرام سمیت کئی ایک تنظیمیں اس کی مثال ہیں۔

عالمی تشدد کی موجودہ لہر کی کئی ایک وجوہات میں سے ایک وجہ مندرجہ بلا عوامل ہی ہیں دہشت گردی کے خلاف جنگیں اور اتحاد محض وقتی دار سی تو کر سکتے ہیں مگر بذاتِ خود یہ کوئی حل نہیں ہے۔اس مسلے کو مستقل بنیادوں پر حل کرنے کے لیے آج پھر ایک نئے عالمی معاہدہ عمرانی کو تشکیل دینے کی ضرورت ہے۔آج دنیا ایک ارتقائی عمل سے گزر رہی ہے۔اس کی شکل تبدیل ہو رہی ہے۔تبدیل ہوتی ہوئی دنیا ایک فطری عمل ہے۔نئے عالمی معاہدہ عمرانی کا موضوع ریاست ہی ہو گا۔ریاست کی موجودہ تعریف گلوبلائزیشن اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اثرات کو اپنے اندر نہیں سمو سکتی اسی لیے ریاست کی نئی تعریف کی ضرورت ہے جس میں گلوبلائزیشن اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اثرات کو بھی مدِ نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ گلوبلائزیشن کا ٹارگٹ اقتصادیات اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا ہدف ثقافت،زبان اور تاریخ ہوتے ہیں۔ریاست کی تشکیل میں انہی عناصر کا اہم کردار ہوتا ہے۔

اگر ریاست کی از سر نو تعریف کرنے کی طرف قدم نہیں اٹھایا جاتا تو دنیا میں دو طرح کے نظام معرضِ وجود میں آ جائیں گے۔ایک عالمگیریت کا حامی ہو گا جب کہ دوسرا اس کا باغی ہوگا اور وہ چھوٹی ریاستوں اور گرہوں کی شکل میں ہوگا جس طرح اب داعش کی اپنی مجوزہ ریاست ہے۔اس طرزِ عمل میں مسلسل انتشار

اور خون خرابہ ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ عالمی رہنماء اور مفکرین اس مسلے کا مستقل حل تلاش کرکے انسانیت کو تباہ ہونے سے بچائیں۔

اسلامی ملکوں کا فوجی اتحاد۔۔۔مقاصد کیا ہیں؟ 34

دسمبر 2015 کو سعودی عرب کے وزیر دفاع محمد بن سلمان السعود نے 1534 اسلامی ملکوں کی افواج پر مشتمل ایک فورس کی تشکیل کا اعلان کیا اس اتحاد کو The Islamic Miltry Alliance to Fight Terrorism(IMAFT) کا نام دیا گیا۔اس فورس کا مرکزی دفتر سعودی عرب کے درالحکومت ریاض میں قائم کیا گیا۔اس فورس کی تشکیل کا بنیادی مقصد اسلامی ممالک کے خلاف سرگرم ہر قسم کی دہشت گرد تنظیموں اور گروپوں کے خلاف کاروائیاں کرنا قرار پایا تھا۔اس بات کا بھی عندیہ دیا گیا تھا کہ یہ اتحاد عراق،شام،لیبیا،مصر اور افغانستان میں موجود دہشت گردوں کے خلاف بھی کاروائیاں کرے گا۔البتہ اس بات کا بھی اقرار کیا گیا تھا کہ یہ اتحاد اقوامِ متحدہ اور او آئی سی کے منشور کی پاسداری بھی کرے گا اور ان کے مروجہ خطوط کے اندر رہ کر اپنا کردار ادا کرے گا۔اس کے ممبر ممالک میں سعودی عرب سب سے زیادہ متحرک ممبر ہے۔

اس اتحاد کی فوجی قوت کا زیادہ تر انحصار پاکستان،ترکی،متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب پر ہے۔ان ممالک میں پاکستان ہی واحد ایٹمی طاقت ہے۔ترکی کی فوج منظم اور با صلاحیت ہے۔امارات کی فضائیہ جدید ہے اور سعودی عرب مالی

معاونت کے لیے موزوں ہے۔ان کے سوا باقی کے ممالک عددی قوت فراہم کرنے کے لیے ہیں۔

9/11 کے بعد سے امریکی اور نیٹو افواج نے مسلم ممالک میں بھرپور کاروائیاں کیں۔اگرچہ انہیں اقوام متحدہ کی منظوری حاصل تھی مگر پھر بھی ان کا اسلامی ممالک میں فوجی کردار مناسب نہیں تھا۔عراق اور افغانستان میں ان افواج نے انسانی قدروں کو جس طرح پامال کیا اس کی مثال تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔اسلامی ملکوں میں غیر مسلم فوجوں کی موجودگی نے بھی مسلمانوں کے دلوں میں شدت کے جذبات کا ابھارا ہے۔

اب مسلم دنیا میں اقوامِ متحدہ کی امن فوج کے ہوتے ہوئے نیٹو افواج کا اسلامی ممالک میں کاروائیاں کرنا محض مسلم دشمنی ہی تصور کیا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج کا مسلمان امریکہ اور یورپ کے خلاف ہے۔انتہا پسند ان جذبات سے کھلواڑ کرتے ہوئے نوجوان مسلمانوں کو شدت پر اکساتے ہیں۔مسلم دنیا میں ایک یہ تصور بھی سامنے آیا ہے کہ پہلے فرانس اور اب بیلجئیم میں ہونے والے دھماکے اسی ردِ عمل کا نتیجہ ہے۔امریکہ اور نیٹو کی لگائی ہوئی آگ اب پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔اس کی حدت کو کم کرنا اور پھر مکمل طور پر ختم کرنا مسلمان ملکوں کے ساتھ ساتھ باقی ممالک کا بھی فرض ہے۔

سعودی عرب کا خیال ہے کہ مسلم ممالک میں موجود دہشت گردوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمان فوج ہی ہونا ضروری ہے۔اسی نظریے کی بنیاد پر اس نے 34 ممالک پر مشتمل فوجی اتحاد تشکیل دیا ہے۔ اگر یہ فوجی اتحاد مسلم دنیا میں دہشت گردی کے خلاف نبرد آزما ہو تو مسائل بہت جلد ہو سکتے ہیں۔ عالمی امن کی بھی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ مگر اس سب کے باوجود اس اتحاد کی تشکیل میں دیگر عوامل اور افکار بھی کار فرما ہیں۔ یہ اتحاد انتہائی عجلت میں تشکیل دیا گیا ہے۔پاکستان جیسے اہم ملک سے بھی مشاورت نہیں کی گئی شروع میں پاکستان نے سرکاری سطح پر اس اتحاد میں اپنی شمولیت پر حیرت کا اظہار کیا تھا۔ایک سوچ یہ بھی سامنے آئی ہے کہ سعودی عرب ایران میں شیعوں کی حکومت اور شام میں علویوں کی حکومت کو ختم کرنا چاہتا ہے۔اسی طرح یمن میں ایران نواز تحریک کے خاتمے کے لیے بھی وہ وہاں مشترکہ طاقت استعمال کرنا چاہتا
ہے۔ایران،شام اور یمن کی اس اتحاد میں عدم شمولیت اس سوچ کو تقویت فراہم کرتی ہے۔

اسلامی ممالک کے اس اتحاد کو جدید اسلحہ کی بھی ضرورت ہے بد قسمتی سے اب تک 34 کوئی بھی اسلامی ملک اسلحہ سازی کی صنعت میں خود کفیل نہیں ہے۔ان ممالک کو اسلحہ کی خریداری کے لیے امریکہ اوریورپ سے ہی رجوع کرنا پڑتا ہے۔یہ بھی ممکن ہے کہ امریکہ اور یورپ ہی اس فوجی اتحاد کے قیام کے بنیادی محرک ہوں تاکہ ان کی اسلحہ ساز فیکٹریوں کا بنایا ہوا اسلحہ یہاں فروخت ہو

سکے۔او آئی سی کو فوری طور پر اس معاملے کو دیکھنا چاہیے۔جو اسلامی ممالک اس اتحاد میں شامل نہیں ہیں ان کے خدشات اور اعتراضات کو بھی سمجھنا چاہیے۔صرف 34 نہیں بلکہ تمام اسلامی ملکوں کی افواج پر مشتمل ایک مشترکہ فورس تشکیل دی جائے۔یہ کام بڑی سمجھ کے ساتھ کرنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ مسلمان ایک بار پھر کسی اور سازش کا شکار ہو جائیں۔

پاناما پیپرز کے ممکنہ محرکات اور اثرات

پاناما لیکس نامی سکینڈل کے منظر عام پر آنے سے دنیا کے کئی ممالک کی سیاست میں ہلچل پیدا ہو گئی ہے۔ جن ممالک کے سیاستدان اور حکمران اس سکینڈل کی زینت بنے ہیں وہاں سیاسی درجہ حرارت بڑھا ہے۔ دنیا کے کچھ ممالک نے اس کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے اور کچھ نے اس میں افشا کیے جانے والے رازوں کو محض الزامات قرار دیا ہے۔ مغرب میں اس پر مشرق کی نسبت ردِ عمل مختلف آیا ہے۔ وہاں ان انکشافات پر تحقیقات ہو رہی ہیں۔ دو وزرائے اعظم مستعفی ہو چکے ہیں۔ برطانوی وزیر اعظم پر بھی شدید دباؤ ہے۔ ایشائی ممالک نے ان انکشافات کو سنجیدہ نہیں لیا ہے۔ سب سے دلچسپ ردِ عمل پاکستان سے آیا ہے۔ یہاں کے وزیر اعظم نے بھی قوم سے خطاب کیا ہے اور چھپائی ہوئی دولت کو محنت کی کمائی قرار دیا ہے۔ روس نے اسے سازش قرار دیا ہے۔ مسلم ممالک نے بھی اس رپورٹ کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ اس رپورٹ میں اس رقم کا تذکرہ ہے جو بغیر کوئی ٹیکس ادا کیے جمع کی گئی ہے اور اسے ریاستی اور عالمی قوانین سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔

اس وقت دنیا بھر میں سرمایہ دارانہ نظام نے اپنی جڑیں مضبوط کر رکھی ہیں۔ اس نظام نے دنیا بھر کے وسائل پر اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ عمرانی نظریوں کے

مطابق ان وسائل پر حق عام عوام کا ہوتا ہے اور ریاست ان وسائل کی رکھوالی ہوتی ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تمام بیانیوں میں تبدیلی آچکی ہے۔اب دنیا کے تمام وسائل سرمایہ دار کے ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ گئے ہیں۔اس کے مقابلے میں ریاست معاشی طور پر کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں حالیہ سالوں میں معاشی زوال یا عدم استحکام دیکھنے کو مل رہا ہے۔بیروزگاری اور مہنگائی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ عوام میں بے چینی بڑھ رہی ہے۔دولت غیر ریاستی عناصر کے پاس جمع ہو رہی ہے اور وہی عناصر طاقت ور ہو رہے ہیں۔جائز دولت کے مقابلے میں کالے دھن میں اضافہ ہو رہا ہے۔اگر ریاست کمزور ہو گی تو انتشار اپنے عروج پر ہو گا اور عام آدمی تکلیف میں ہو گا۔ریاستوں کے علم میں یہ بات بخوبی ہے کہ کالے دھن کی ایک بڑی مقدار آف شور کمپنیوں کی مدد سے مخصوص بینکوں میں موجود ہے مگر اسے حاصل کرنا ان کے بس میں نہیں ہے۔پاناما لیکس کے بعد دنیا بھر میں ایک بھرپور عوامی تحریک اٹھی ہے اس تحریک کی طاقت سے ریاستیں اس کالے دھن کو اپنے استعمال میں لانا چاہتی ہیں۔اگر یہ سارا کالا دھن اوپن مارکیٹ میں آ جائے تو دنیا کی معیشت بہت بہتر ہو جائے گی۔حال ہی میں پاکستان مین بھی کالے دھن کو سفید کرنے کی کوشش کی گئی مگر یہاں سے حاصل کیا گیا کالا دھن باہر کے ملکوں میں موجود ہونے کی بدولت کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہو سکا۔اس کے ساتھ ساتھ ایک نظریہ اور بھی موجود ہے۔ان پیپرز میں کسی بھی امریکی کا نام نہیں

ہے۔ یہ کاروبار وہاں بھی بہت مقبول ہے۔ کیا امریکہ کسی عالمی قانون سازی کے بعد اس سارے کالے دھن کو خود تو نہیں ہتھیانا چاہتا ہے؟ کیا یوروکے مقابلے میں ڈالر کو استحکام دینا مقصود تو نہیں ہے؟ کیا امریکہ یورپ اور ایشیاکے معاشی نظام کو مزید کسی امتحان میں ڈالنا چاہتا ہے۔ اس سارے منظر نامے میں روسی صدر کے بیان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت دنیا میں دو متوازی معاشی نظام چل رہے ہیں۔ ایک نظام کو ریاست قوانین کے ذریعے کنٹرول کرتی ہے اور دوسرا نظام غیر ریاستی عناصر چلا رہے ہیں۔ سرمایہ داری نظام میں کالے دھن کے علاوہ کوئی اور دھن قابلِ قبول نہیں ہوتا ہے۔ اب ان دونوں میں ٹکراؤ پیدا ہو چکا ہے۔ طاقت ور نے ہی باقی رہنا ہے۔ لہٰذا ریاستوں کو انتہائی سمجھ بوجھ کا مظاہرہ کرنا ہوگا کیونکہ اب ریاست کے مقابلے میں غیر ریاستی عناصر کے پاس پیسہ زیادہ ہے۔ اگر اس دوسرے نظام کو قانونی حیثیت نہ دی گئی تو دنیا کی معیشت بیگاڑ دی جائے گی۔ آف شور کمپنی کوئی خاص چیز نہیں ہوتی ہے۔ ذریعہ معاش اہم ہوتا ہے۔ عوامی عہدوں پر فائز افراد کا اخلاقی معیار سخت ہونا چاہیے۔ ریاستی افراد اور سیاسی نظام میں بہتری لانے کی ضرورت ہے۔ غیر ریاستی نظام کو تباہ کرنے کی بجائے اسے مراعات دے کر ریاستی دائرے میں لانے کی ضرورت ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام سے چھٹکارا شور اور واویلا کرنے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے کے لیے سوچ، فکر

حکمتِ عملی اور ایک لمبی تحریک کی ضرورت ہوتی ہے۔

اڑتی ہوئی گرد میں ان کا بھلا ہے

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں نہ تو کہیں اسلام نظر آتا ہے اور نہ ہی کہیں جمہوریت دیکھائی دیتی ہے۔اسلام کا دیا گیا بہترین نظامِ عدل، مساوات اور مساویانہ معاشی نظام کا وجود دور دور تک اس معاشرے میں نظر نہیں آتا ہے۔ جمہوری اقدار نہ تو یہاں پنپ سکی ہیں اور نہ ہی ان کو رائج کرنے کی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔ پاکستانی عوام کو کبھی اسلام کے نفاذ اور کبھی جمہوریت اور عدلیہ کی بحالی کی تحریکوں میں مصروف رکھا گیا ہے۔ان کی توانائیوں کو لاحاصل کوششوں میں ضائع کیا گیا ہے۔ ہر دور کی پاکستانی قیادت نے عوام کے جذبات سے کھلواڑ کرکے اپنے مقاصد کو پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے۔اسلامی جمہوریہ پاکستان کا خواب تو شرمندہِ تعبیر نہ ہو سکا مگر یہ ملک اور اس کے عوام سرمایہ داروں کے شکنجے میں بری طرح جکڑے جا چکے ہیں۔سرمایہ دارانہ نظام کی آکاس بیل نے جمہوریت کے پودے کو مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔اب یہ پودا اس وقت تک تناور درخت نہیں بن سکتا ہے جب تک اس سرمایہ دارانہ آکاس بیل کو اس سے الگ نہ کیا جائے۔

پاکستان میں پاناما پیپرز کا ہنگامہ اپنے عروج پر رہا ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ہنگامہ اب تفریح میں تبدیل ہو رہا ہے۔یہاں کے سرمایہ داروں نے

یہ کھیل بڑی مہارت کے ساتھ کھیلا ہے۔ایک آسان اور سادہ مسلے کو پیچیدہ بنا دیا گیا اور اب اسے اتنا طول دیا جا رہا ہے کہ یہ اپنی موت آپ ہی مر جائے گا۔جب پاناما سکینڈل سامنے آیا تو پاکستانی وزیر اعظم کے بچوں کے نام کے ساتھ ساتھ چار سو کے لگ بھگ دیگر پاکستانیوں کے نام بھی سامنے آئے۔پاکستانی میڈیا نے اسے خوب ہوا دی۔میڈیا اور اپوزیشن نے وزیر اعظم اور ان کے بچوں کو خوب آڑے ہاتھوں لیا مگر باقی افراد کو نظر انداز کر دیا۔ایسا دانستہ کیا گیا اور معاملے کو سیاسی بنا دیا گیا۔نواز شریف خود سرمایہ داروں کے سرخیل ہیں بھلا وہ کیوں کر چاہیں گے کہ اس معاملے کی فوری اور شفاف تحقیقات ہوں۔اگر وہ سنجیدہ اور مخلص ہوتے تو ایف آئی اے اور نیب کو شفاف اور غیر جانبدارانہ تحقیقات کا حکم دیتے۔یہ ادارے صرف اس بات کا پتہ لگاتے کہ کیا یہ سرمایہ قانونی طور پر کمایا گیا ہے ؟اور کیا اس سرمایے کو قانونی طریقے سے ملک سے باہر بھیجا گیا ہے؟یہ دونوں ادارے یہ کام ہفتوں میں مکمل کر لیتے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا۔مگر یہاں نیتوں کے فتور تھے۔وزیر اعظم اپنے ساتھ ساتھ دیگر چار سو کے لگ بھگ سرمایہ داروں کو بھی بچانا چاہتے تھے۔پیپلز پارٹی اور تحریک انصاف نے بھی بڑے منافقانہ انداز میں ان کا ساتھ دیا۔اس منافقت کے بارے میں اس وقت معلوم ہوا جب گزشتہ پیر کو وزیر اعظم کے قومی اسمبلی میں خطاب کے بعد اپوزیشن نے متفقہ طور پر واک آوٹ کیا۔پاکستانی عوام اور میڈیا اس بات کی توقع کر رہے تھے کہ وزیر اعظم کے

خطاب کے بعد اپوزیشن وزیر اعظم سے کڑے سوالات کرے گی۔ مگر ٹاک شوز میں گرجنے والے اسمبلی نہ برسے اور یوں وزیر اعظم کے جمہوری احتساب کا موقع دانستہ طور پر گنوا دیا گیا۔ پیپلز پارٹی میثاقِ جمہوریت کی بدولت مسلم لیگ ن کا ساتھ دے رہی ہے۔ تحریک انصاف کے دو مرکزی لیڈروں کے نام بھی اس سکینڈل میں آ چکے ہیں۔ سرمایہ دار کبھی بھی کسی سرمایہ دار کا احتساب نہیں کرے گا بلکہ اس کے سرمائے کے تحفظ کے لیے ہی اقدامات کرے گا۔ پاکستانی عوام اور میڈیا نے بے جا توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ کیمونزم معاشروں میں بھی کرپشن ہوا کرتی ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں کرپشن نہ ہو۔ مگر نہ کوئی اس کرپشن کو پکڑ سکتا ہے اور نہ ہی بے رحمانہ احتساب ہوتا دیکھائی دے رہا ہے۔ ایسے میں عوام مجہول ہوتے دیکھائی دے رہے ہیں۔

اب اپوزیشن پارلیمانی کمیٹی کے قیام پر راضی ہو گئی ہے 70 سولات بھی ترتیب دے دیے گئے ہیں۔ نہ نو من تیل ہو گا نہ رادھا ناچے گی۔ جانے کب ان ستر سوالوں کے جواب ملیں گے؟ طوالت افادیت کھو دیتی ہے۔ برطانیہ نے بھی ایک کمیٹی بنائی ہے جو باہر سے لائی گئی دولت کا جائزہ لے گی غیر قانونی دولت ان ملکوں کی حکومتوں کو واپس کر دی جائے گی۔ پاکستانی وفد نے اس کمیٹی کے اجلاس میں شرکت نہیں کی۔ نواز شریف بھلا کیونکر چاہیں گے کہ ان کے بچوں اور سرمایہ دار دوستوں کی دولت پاکستان آئے۔ یہ سب لوگ ایسے ہی گرد اُڑائے رکھنا چاہتے ہیں

اور اپنے آپ کو اس گرد میں چھپائے رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اسی میں اپنا بھلا جانتے ہیں۔ اب صرف قدرت سے ہی امید ہے کہ وہ منظر کو صاف کرے اور کریہٹ چہرے بے نقاب کرے۔

قومی خود مختاری کا تعین کون کرے؟

کسی بھی ریاست کی خود مختاری کی حدود کا تعین اس کے عوام ہی کرتے ہیں۔اس خود مختاری کے تحفظ کے فرائض ریاست اپنے مخصوص اداروں کو تفویض کرتی ہے۔خود مختاری کی تعریف میں ردو بدل کا اختیار صرف اور صرف عوام کو ہی حاصل ہے۔ مخصوص ادارے اس تعریف کو بدلنے کا اختیار نہیں رکھتے۔اسی طرح بین الاقوامی قوانین کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ریاستی عوام اپنی جغرافیائی حدود کا بھی تعین خود کرتے ہیں۔ان حدود کا تحفظ بھی ریاستی اداروں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔جغرافیائی حدود میں رد و بدل کا اختیار بھی صرف عوام کو ہی ہوتا ہے۔عوام اپنے نمائندے منتخب کرکے پارلیمان میں بھیجتے ہیں اور وہی نمائندے عوام کے عطا کردہ اختیارات کا استعمال کرتے ہیں۔پارلیمنٹ حکومت کا ادارہ اہم ادارہ ہوتا ہے ریاست کے باقی ادارے اسی حکومتی ادارے کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔اگر ریاست کے معاملات اسی اصول کے تحت چلتے رہیں تو ریاست کی عزت اور توقیر میں اضافہ ہوتا رہے گا۔کوئی دوسری ریاست اس کے معاملات میں دخل دینے سے گریزاں رہے گی۔ایسی ریاست کی قومی سلامتی اور قومی خود مختاری پر کبھی بھی آنچ نہیں آئے گی۔لیکن اگر اس کے برعکس ریاستی ادارے حکومتی اداروں سے ماوراء فیصلے کرنے لگ جائیں اور پارلیمان کو خاطر میں نہ لائیں تو پھر ریاست کی خود مختاری اور سلامتی کو

خطرات لاحق ہونے شروع ہو جائیں گے۔ایسی ریاست کی عزت پر بھی حرف آئے گا اور اس کی توقیر بھی متاثر ہو گی۔

بد قسمتی سے پاکستانی ریاست ان دنوں اسی قسم کے مسائل کا شکار ہے۔ پاکستان میں ریاستی ادارے حکومتی اداروں سے زیادہ طاقتور اور بااثر ہو چکے ہیں۔جمہوری نظام میں تسلسل کا نہ ہونا اس کی بنیادی وجہ ہے۔پاکستان میں ابہام کی صورت ہمہ وقت موجود رہتی ہے۔افغان طالبان رہنما ملا منصور کی پاکستان میں ہلاکت اور انگور اڈا چیک پوسٹ کا انتظام افغان فورسز کے سپرد کرنے کے واقعات نے اس ابہام کو مزید گہرا کر دیا ہے۔حکومت اس طرح کے معاملات میں بے بس یا لاعلم نظر آتی ہے۔حالیہ ڈرون حملے پر وزیر اعظم کا بیان اور انگور اڈا چیک پوسٹ کی حوالگی پر وزیر داخلہ کا بیان اس کی واضح مثال ہے۔ڈروں حملے کے بارے میں سات گھنٹے بعد وزیر اعظم کو امریکی عہدے دار نے اطلاع دی۔اسی طرح چیک پوسٹ کی حوالگی بھی حکومت سے پوچھے بغیر کی گئی۔ایسی صورتِ حال ریاست کی سلامتی اور بقا کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ریاستی ادارے فیصلہ سازی بھی کرنے لگے ہیں جبکہ یہ اختیار صرف منتخب پارلیمان کو ہی ہے۔ تمام ریاستی اداروں کے فرائض آئین نے مقرر کر رکھے ہیں ان کے حدود کا تعین بھی کر دیا گیا ہے۔جب ادارے آئین سے انحراف اور حدود سے تجاوز کرنے لگیں تو ریاست میں انتشار پھیلنا شروع ہو

جاتا ہے۔پاکستان میں اس کے آثار نمایاں ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ان حالات میں پارلیمنٹ کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔اسے اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

بد قسمتی سے پاکستان کی پارلیمنٹ ان حالات میں کمزور دیکھائی دے رہی ہے۔اس کی بے بسی عوام کو پریشان کر رہی ہے۔ریاستی اداروں نے سیاستدانوں پر کرپشن کے الزامات کی بوچھاڑ کر رکھی ہے۔یہ تاثر زور پکڑ چکا ہے کہ سول قیادت کرپٹ ہے۔مگر کرپشن دیگر ریاستی اداروں کو بھی دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے اس کرپشن کی بدولت وہ بھی کھوکھلے ہوتے جا رہے ہیں ان کی کارکردگی پر بھی اب انگلیاں اٹھ رہی ہیں۔عوام پریشان ضرور ہیں مگر نا امید ہر گز نہیں ہیں۔ان کی توقعات اب بھی اپنے منتخب نمائندوں سے ہی وابستہ ہیں۔تمام تر مسائل کو حل انہیں نمائندوں نے ہی کرنا ہے۔

آج پاکستانی قوم ریاستی اداروں کی خواہش پر قربانیاں دے رہی ہے۔عجب ستم ظریفی ہے کہ آج جو چیک پوسٹ افغان فورسز کے حوالے کی گئی کل وہی پوسٹ پاکستانیوں کو ایک لمبی جنگ کے بعد واپس لینی پڑے۔قربانیوں کا یہ لامتناہی سلسلہ کب جا کے رکے گا اس کا فیصلہ ریاستی اداروں کو نہیں بلکہ عوام کے منتخب کردہ پارلیمان کو کرنا ہوگا۔

پاکستانی پارلیمنٹ کو متحرک ہونا ہوگا۔اسے قومی خود مختاری کا تعین خود کرنا ہوگا۔قومی سلامتی کی پالیسی خود وضع کرنا ہوگی۔خارجہ پالیسی از سرِ نو خود مرتب کرنا ہو گی۔پارلیمنٹ کو عوام کے تفویض کردہ اختیارات کو استعمال میں لاتے ہوئے تمام فیصلے خود کرنے ہوں گے۔یہی عمل ریاست کو دوام اور عزت بخش سکتا ہے۔

قومی خود مختاری کا تعین کون کرے؟

کسی بھی ریاست کی خود مختاری کی حدود کا تعین اس کے عوام ہی کرتے ہیں۔اس خود مختاری کے تحفظ کے فرائض ریاست اپنے مخصوص اداروں کو تفویض کرتی ہے۔خود مختاری کی تعریف میں ردو بدل کا اختیار صرف اور صرف عوام کو ہی حاصل ہے۔ مخصوص ادارے اس تعریف کو بدلنے کا اختیار نہیں رکھتے۔اسی طرح بین الاقوامی قوانین کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ریاستی عوام اپنی جغرافیائی حدود کا بھی تعین خود کرتے ہیں۔ان حدود کا تحفظ بھی ریاستی اداروں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔جغرافیائی حدود میں رد و بدل کا اختیار بھی صرف عوام کو ہی ہوتا ہے۔عوام اپنے نمائندے منتخب کرکے پارلیمان میں بھیجتے ہیں اور وہی نمائندے عوام کے عطا کردہ اختیارات کا استعمال کرتے ہیں۔پارلیمنٹ حکومت کا ادارہ اہم ادارہ ہوتا ہے ریاست کے باقی ادارے اسی حکومتی ادارے کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔اگر ریاست کے معاملات اسی اصول کے تحت چلتے رہیں تو ریاست کی عزت اور توقیر میں اضافہ ہوتا رہے گا۔کوئی دوسری ریاست اس کے معاملات میں دخل دینے سے گریزاں رہے گی۔ایسی ریاست کی قومی سلامتی اور قومی خود مختاری پر کبھی بھی آنچ نہیں آئے گی۔لیکن اگر اس کے برعکس ریاستی ادارے حکومتی اداروں سے ماوراء فیصلے کرنے لگ جائیں اور پارلیمان کو خاطر میں نہ لائیں تو پھر ریاست کی خود مختاری اور سلامتی کو

خطرات لاحق ہونے شروع ہو جائیں گے۔ایسی ریاست کی عزت پر بھی حرف آئے گا اور اس کی توقیر بھی متاثر ہو گی۔

بد قسمتی سے پاکستانی ریاست ان دنوں اسی قسم کے مسائل کا شکار ہے۔ پاکستان میں ریاستی ادارے حکومتی اداروں سے زیادہ طاقتور اور بااثر ہو چکے ہیں۔جمہوری نظام میں تسلسل کا نہ ہونا اس کی بنیادی وجہ ہے۔پاکستان میں ابہام کی صورت ہمہ وقت موجود رہتی ہے۔افغان طالبان رہنما ملا منصور کی پاکستان میں ہلاکت اور انگور اڈا چیک پوسٹ کا انتظام افغان فورسز کے سپرد کرنے کے واقعات نے اس ابہام کو مزید گہرا کر دیا ہے۔حکومت اس طرح کے معاملات میں بے بس یا لاعلم نظر آتی ہے۔حالیہ ڈرون حملے پر وزیر اعظم کا بیان اور انگور اڈا چیک پوسٹ کی حوالگی پر وزیر داخلہ کا بیان اس کی واضح مثال ہے۔ڈروں حملے کے بارے میں سات گھنٹے بعد وزیر اعظم کو امریکی عہدے دار نے اطلاع دی۔اسی طرح چیک پوسٹ کی حوالگی بھی حکومت سے پوچھے بغیر کی گئی۔ایسی صورتِ حال ریاست کی سلامتی اور بقا کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ریاستی ادارے فیصلہ سازی بھی کرنے لگے ہیں جبکہ یہ اختیار صرف منتخب پارلیمان کو ہی ہے۔ تمام ریاستی اداروں کے فرائض آئین نے مقرر کر رکھے ہیں ان کے حدود کا تعین بھی کر دیا گیا ہے۔جب ادارے آئین سے انحراف اور حدود سے تجاوز کرنے لگیں تو ریاست میں انتشار پھیلنا شروع ہو

جاتا ہے۔پاکستان میں اس کے آثار نمایاں ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ان حالات میں پارلیمنٹ کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔اسے اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

بد قسمتی سے پاکستان کی پارلیمنٹ ان حالات میں کمزور دیکھائی دے رہی ہے۔اس کی بے بسی عوام کو پریشان کر رہی ہے۔ریاستی اداروں نے سیاستدانوں پر کرپشن کے الزامات کی بوچھاڑ کر رکھی ہے۔یہ تاثر زور پکڑ چکا ہے کہ سول قیادت کرپٹ ہے۔مگر کرپشن دیگر ریاستی اداروں کو بھی دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے اس کرپشن کی بدولت وہ بھی کھوکھلے ہوتے جا رہے ہیں ان کی کارکردگی پر بھی اب انگلیاں اٹھ رہی ہیں۔عوام پریشان ضرور ہیں مگر نا امید ہر گز نہیں ہیں۔ان کی توقعات اب بھی اپنے منتخب نمائندوں سے ہی وابستہ ہیں۔تمام تر مسائل کو حل انہیں نمائندوں نے ہی کرنا ہے۔

آج پاکستانی قوم ریاستی اداروں کی خواہش پر قربانیاں دے رہی ہے۔عجب ستم ظریفی ہے کہ آج جو چیک پوسٹ افغان فورسز کے حوالے کی گئی کل وہی پوسٹ پاکستانیوں کو ایک لمبی جنگ کے بعد واپس لینی پڑے۔قربانیوں کا یہ لامتناہی سلسلہ کب جا کے رکے گا اس کا فیصلہ ریاستی اداروں کو نہیں بلکہ عوام کے منتخب کردہ پارلیمان کو کرنا ہوگا۔

پاکستانی پارلیمنٹ کو متحرک ہونا ہوگا۔اسے قومی خود مختاری کا تعین خود کرنا ہوگا۔ قومی سلامتی کی پالیسی خود وضع کرنا ہو گی۔ خارجہ پالیسی از سر نو خود مرتب کرنا ہو گی۔پارلیمنٹ کو عوام کے تفویض کردہ اختیارات کو استعمال میں لاتے ہوئے تمام فیصلے خود کرنے ہوں گے۔یہی عمل ریاست کو دوام اور عزت بخش سکتا ہے۔

پاکستان نے ایک موقع گنوا دیا

پاکستان جس خطے میں واقع ہے وہاں کے حالات تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔اس کے پڑوسی ممالک کے تعلقات میں حیرت انگیز تبدیلیاں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔ مختلف مذاہب اور نظریات کے ملک ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں جبکہ دوسری طرف تاریخی دوستانہ تعلقات رکھنے والے ممالک میں دوریاں بڑھ رہی ہیں۔بڑی طاقتوں کی ترجیحات میں بھی تبدیلی آ رہی ہے۔ایسے حالات میں پاکستانی قیادت کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں اور خطے میں تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے منظر نامے کو سمجھنے اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے مربوط حکمتِ عملی اپنانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔اگر اس منظر نامے سے صرفِ نگاہ برتا گیا تو پاکستانی عوام کو اس خطے میں ایک بہت بڑی تبدیلی دیکھنے کے لیے تیار رہنا ہو گا۔

جس دن سے ایران عالمی اقتصادی پابندیوں سے آزاد ہوا ہے وہ اس دن سے خطے کی سیاست میں کافی متحرک اور سرگرم ہو چکا ہے۔اس نے سب سے پہلے پاکستان سے ہی رجوع کیا تھا۔گیس پائپ لائن منصوبے کو مکمل کرنے کے لیے اس نے پاکستان سے مدد کی درخواست بھی کی تھی مگر پاکستان نے سرد مہری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی دوسرے دوست اسلامی ملک کو خوش کرنے کے لیے اس درخواست کو التوا میں ڈال

دیا تھا۔ایران پاکستان کے ساتھ مزید معاشی منصوبوں پر کام کرنا چاہتا تھا مگر پاکستان نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔پاکستان کا خیال ہے ملک میں جاری سی پیک منصوبہ اس کی معاشی حالت کو بدل دے گا مگر دیگر پڑوسی ممالک کی آپس کی قربت اب اس منصوبے کا فیض شاہد ہی اس ملک کو پہنچنے دے۔پاکستان نے ایران کی پیشکش کو نظر انداز کرکے ایک بہت بڑا موقع گنوا دیا ہے۔پاکستان نے جوں ہی ایران سے ذرا دوری اختیار کی بھارت اس کے بہت قریب آگیا۔چار بہار بندرگاہ منصوبے سمیت کئی ایک بڑے اقتصادی منصوبے یہ دونوں ملک لانچ کر چکے ہیں۔افغانستان پہلے ہی پاکستان سے کچھ نالاں تھا جس کا ان دونوں ملکوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اب یہ تینوں ملک اس خطے کے بڑے اتحادی بن کر سامنے آ چکے ہیں۔روس کا جھکاؤ بھی ایران اور بھارت کی طرف ہے۔پاکستان اب سب سے زیادہ انحصار چین پر کرنے لگا ہے۔چین پاکستان میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کر رہا ہے۔پاکستان میں بڑھتے ہوئے اس کے اثر کی بدولت امریکہ پاکستان سے ہاتھ کھینچ رہا ہے۔وہ مختلف حیلے بہانوں سے اسے دی جانے والی امداد پر قدغن لگا رہا ہے۔وہ پاکستان میں اپنے اقتصادی منصوبوں کو کم کر رہا ہے۔امریکہ پاکستان میں بڑھتے ہوئے چینی اثر رسوخ کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا ہے۔اسی وجہ سے وہ پاکستان سے دور ہو رہا ہے۔امریکہ اور چین کے اقتصادی منصوبوں میں ایک فرق ہے جسے پاکستانی عوام کو لازمی سمجھنا ہوگا۔امریکی منصوبے عوامی فلاح و بہبود کے حامل ہوتے ہیں۔وہ تعلیم، صحت، پینے

کے صاف پانی کی فراہمی اور اداروں میں اصلاحات سمیت کئی ایک منصوبوں پر کام کر رہے تھے۔ان کی امداد کا تعلق براہ راست پاکستانی عوام تک تھا۔جبکہ چین کے منصوبے عوامی فلاح کی بجائے فوجی اور کاروباری نوعیت کے ہیں۔چین ایک کیمونسٹ ملک ہے ۔اسے صرف اپنا مفاد عزیز ہے کیمونزم میں دوستی کا مطلب ذرا مختلف ہے۔وہ پاکستان کو اپنے لیے محض ایک فرسٹ ڈیفنس لائن کے طور پر ہی دیکھتا ہے۔چین دیگر ملکوں سے الجھنے کی پالیسی کے خلاف ہے اور دو ملکوں کے درمیان تنازعات پر ہمیشہ الگ ہی رہتا ہے۔ایسے میں پاکستان اس خطے میں تنہا ہوتا ہوا ملک نظر آ رہا ہے۔اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ پاکستانی قیادت کو اس کی سنگینی کا احساس تک نہیں ہے۔تین سالوں سے وزارت خارجہ بغیر وزیر کے ہے۔وزیر اعظم اکثر ملک سے باہر رہتے ہیں وہ ان دنوں بھی لندن میں زیر علاج ہیں۔لگ بھگ تمام حکومتی قیادت بھی ان کے ہمراہ ہے۔حساس معاملات پر حکومتی موقف وزیر اعظم کے صحت یاب ہونے تک التوا میں ہیں۔

ان حالات میں پارلیمنٹ کی خاموشی افسوس ناک ہے۔ملکی حالات پر بحث کرنا اور حکومت کو تجاویز دینا پارلیمان کا ہی کام ہے۔اگر وزیر اعظم کا بیرون ملک قیام مزید طول پکڑتا ہے تو اسے متبادل قیادت کے آپشن پر بھی غور کرنا ہو گا۔پارلیمنٹ کو ہی خارجہ پالیسی کی گائیڈ لائنز سیٹ کرنا ہوں گی۔دوست ممالک کا تعین کرنا ہو گا۔اسی پارلیمنٹ کو اپنے اندر سے آغا شاہی جیسے شخص

کو بطورِ وزیر خارجہ آگے لانے کے لیے کردار ادا کرنا ہو گا۔ اگر پارلیمنٹ یوں ہی سوئی رہی تو پھر پاکستانی عوام کو اس خطے میں ایک بہت بڑی تبدیلی دیکھنے کے لیے تیار رہنا ہو گا۔

بھارت اور امریکہ کی قربت ۔۔انتشار کا فروغ

بھارت میں جب سے نریندر مودی وزیر اعظم بنے ہیں اس کے امریکہ کے ساتھ تعلقات میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ بھارت کی وزارتِ خارجہ حالیہ چند برسوں سے کافی متحرک رہی ہے۔ وہ دنیا کو بھارت کی ایک ایسی تصویر پیش کرنے کی کوشش میں رہی ہے کہ جس سے یہ تصور ابھرتا ہو کہ بھارت اب ترقی یافتہ ملک بن چکا ہے۔ دفاعی اور نیوکلئیر شعبے میں اس نے اپنے وسائل کو بے دردی سے خرچ کیا ہے۔ بھارت نے ایٹمی ہتھیاروں کے حصول کے لیے عالمی قوانین اور ضابطوں کو بھی نظر انداز کیا ہے۔ بھارت اپنے اندرونی اور داخلی معاملات کو پسِ پشت ڈال کر محض عالمی سیاست میں کردار ادا کرنا چاہتا ہے۔ پہلے وہ اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کا مستقل رکن بننے کا خواب دیکھتا رہا مگر اس کے اپنے داخلی عدم استحکام کی بدولت عالمی قوتوں نے یہ خواب پورا نہ ہونے دیا۔ اس میدان میں ناکامی کے بعد بھارت اب نیوکلئیر سپلائرز گروپ میں شامل ہونے کا خواہشمند ہے۔ اس کی یہ خواہش تاحال پوری نہیں ہو سکی ہے۔ بھارت یہ بات بخوبی سمجھتا ہے کہ سلامتی کونسل کا مستقل رکن بننے اور این ایس جی میں شمولیت کے لیے اس کے لیے امریکی حمایت از حد ضروری ہے۔

امریکہ کی قربت حاصل کرنے کے لیے بھارت کے پاس اسکے سوا کوئی راستہ نہیں

تھا کہ وہ امریکہ کو پاکستان سے دور کرے۔ بھارتی لابی امریکی انتظامیہ کو یہ باور کرانے میں کامیاب رہی کہ پاکستان نے خطے میں اس کے مفادات کے لیے خلوصِ نیت کے ساتھ کام نہیں کیا ہے اور افغانستان میں عدم استحکام کا بھی پاکستان ذمہ دار ہے۔ بھارت نے افغانستان میں امن کے قیام کے لیے امریکہ کو اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ جنوبی ایشیا میں امریکی مفادات کے فروغ اور تحفظ کے لیے بھارت اس کا اتحادی بن کر سامنے آیا ہے۔ ان دو ملکوں کی قربت کی وجہ کچھ اور بھی ہے۔ امریکہ چین کے بڑھتے ہوئے کاروباری اور تجارتی حجم سے پریشان ہے۔ گوادر بندرگاہ کی تعمیر اور سی پیک منصوبہ اس کے لیے دردِ سر بنے ہوئے ہیں۔ پاکستان میں دہشت گردوں کے خلاف جاری کامیاب آپریشن ضربِ عضب نے اس خطے کو امن کی راہ پر لا کر کھڑا کیا ہے۔ جبکہ امریکہ یہاں اپنی موجودگی کے جواز کے لیے مکمل امن بھی نہیں چاہتا ہے۔ یہی وجہ کہ اسے خطے میں پاکستان کی نسبت کسی غیر سنجیدہ ملک کی دوستی کی ضرورت تھی لہٰذا اب یہ دونوں ملک ایک دوسرے کے بہت قریب آ چکے ہیں۔

بھارت اور امریکہ کی حالیہ قربت خطے کے حالات کو خرابی کی طرف لے کے جا رہی ہے۔ افغانستان میں امریکہ نواز حکومت ہونے کے باعث اس کا جھکاؤ بھی اسی نئے اتحاد کی طرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب افغانستان کی سرحدی فورسز آئے روز پاکستانی فوجیوں پر فائرنگ کر رہی ہیں۔ پاکستان کو ایک نئے محاذ پر الجھایا

جا رہا ہے۔ایک غلطی پاکستان سے بھی ہوئی کہ حالیہ دنوں میں اس نے ایران کے ساتھ تعلقات میں گرمجوشی نہیں دیکھائی جبکہ امریکہ اور بھارت اس کے بہت قریب آ چکے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس کی طرف سے بھی سرحد اب پاکستان کے لیے غیر محفوظ نظر آنے لگی ہے۔ ایل او سی اور بھارت کے ساتھ سرحد پر بھی مستقبل قریب میں فوجی حرکت دیکھنے کو مل سکتی ہے۔بھارت کا امریکی مدد کے طفیل تنہا سپر پاور بننے کا خواب پورے خطے کے امن کو تباہ کر سکتا ہے۔

امریکہ جو اب پاکستان سے دور ہو چکا ہے اسے اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنا ہو گی۔اسے پاکستان کی جغرافیائی حیثیت کو سمجھنا ہو گا۔اسے پاکستانی فوج کی استعدادِ کار کو بھی سمجھنا ہو گا۔اسے اس خطے میں ایک سنجیدہ دوست کی ہمیشہ سے ضرورت رہی ہے اور مستقبل میں بھی رہے گی۔وہ پاکستان کے بغیر اس خطے میں کبھی بھی آسانی کے ساتھ نہیں رہ سکتا ہے اور اگر بھارت کسی مہم جوئی کے بارے میں سوچ رہا ہے تو پاکستان کے پاس نیوکلیئر آپشن موجود ہے۔

امریکہ اور بھارت کو اپنے تعلقات استوار کرنے میں سنجیدگی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔بھارتی عوام کی اکثریت غربت اور افلاس کی چکی میں پس رہی ہے۔مایوسی کی بدولت وہاں علیحدگی کی تحریکوں میں شدت پیدا ہو رہی ہے۔بھارت اپنے وسائل ہتھیاروں کی خریداری کی بجائے عوام کی فلاح پر خرچ کرے۔لوگوں کا معیارِ

زندگی بلند کرنے سے ہی اقوام عالم میں بھارت کی عزت بڑھے گی۔ امریکہ کو بھی اب اپنے اندرونی حالات کو دیکھنا ہوگا وہاں بھی اب دہشت گردی سر اٹھا رہی ہے۔ دونوں ملکوں کو یہ بات یاد رکھنا ہوگی کہ انتشار اور بدامنی پھلانے سے نہ صرف ان کا اپنا وجود خطرے میں پڑ جائے گا بلکہ تاریخ میں بھی ان کا ذکر سیاہ حروف میں ہی ہوگا۔

افغان طالبان کی سفارت کاری

ماہ جولائی کے آخری دنوں میں عالمی ذرائع ابلاغ میں افغان طالبان سے متعلق ایک خبر نمایاں طور پر سامنے آئی ہے۔اس خبر کے مطابق افغان طالبان کے ایک وفد نے ایک بار پھر جولائی کے وسط میں چین کا دورہ کیا ہے۔نیوز ایجنسی روئیٹرز کے مطابق چین کی حکومت کی دعوت پر عباس ستانگزئی کی قیادت میں افغان طالبان کے ایک وفد نے چینی حکام سے ملاقاتیں کی ہیں۔عباس قطر میں قائم طالبان کے سیاسی دفتر کے سربراہ بھی ہیں۔اس وفد کے ارکان کے مطابق طالبان کا کئی ممالک کے ساتھ رابطہ بھی ہے اور ان کی حکومتوں کے ساتھ اچھے تعلقات بھی قائم ہیں۔چین ان ممالک میں سے ایک ہے۔اس وفد نے چینی حکام کو افغانستان میں موجود غیر ملکی افواج کے مظالم سے آگاہ کیا اوران قابض فوجوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے چین سے مدد بھی مانگی گئی ہے۔وفد نے چین سے کہا ہے کہ وہ ان فوجوں کے انخلاء کے لیے عالمی رائے عامہ ان کے حق میں نہ صرف ہموار کرے بلکہ اپنا سفارتی اثر رسوخ بھی استعمال کرے۔چین اس چار فریقی گروپ کا بھی حصہ ہے جس میں پاکستان امریکہ اور افغانستان شامل ہیں۔اس گروپ کا مقصد مذاکرات کے ذریعے افغانستان میں امن قائم کرنا ہے۔یہ گروپ بھی ماضی قریب میں طالبان کے ساتھ مذاکرات کرتا رہا ہے مگر پاکستانی علاقے میں سابق طالبان رہنماء ملا منصور کی ڈرون

حملے میں ہلاکت کے بعد سے یہ سلسلہ اب بند ہے۔

افغانستان ایک طویل عرصے سے بد امنی کا شکار ملک ہے۔دسمبر 1979 میں روسی فوجیں یہاں داخل ہوئی تھیں۔اس وقت امن کی فاختہ یہاں سے ایسے روٹھ کر گئی کہ اب تک واپس نہیں آئی۔صرف روسی فوجوں کو اس ملک سے نکالنے کے لیے 1989 تک دس سالوں میں دس لاکھ افراد لقمہ اجل بنے اور اس سے کئی زیادہ بے وطن ہوئے۔افغانستان میں کوئی بھی پُر اثر حکومت قائم نہ ہو سکی۔مختلف گروہ آپس میں بر سرِ پیکار رہے۔11/9 کے بعد ایک بار پھر افغانوں پر قیامت ٹوٹی اور ایسی تباہی ان کا مقدر بنی جو اب تک ان کا ساتھ دے رہی ہے۔افغانوں کے بارے میں تصور کیا جاتا ہے کہ وہ جنگجو قوم ہیں۔لڑائیاں ان کے مزاج کا حصہ ہیں۔مگر حالیہ عشروں میں بیرونی طاقتوں نے ان کے ساتھ کھلواڑ کیا ہے۔کبھی روس کی مداخلت کبھی امریکہ کی جارحیت اور کبھی نیٹو افواج کی یلغار نے یہاں کے عوام کو پر تشدد بنا دیا ہے۔ایران، بھارت اور پاکستان نے بھی اپنے مخصوص مقاصد کے لیے ان افغانوں کو نہ صرف استعمال کیا بلکہ اپنی بساط انہیں کی سرزمین پر بچھا رکھی ہے۔ناخواندگی کی شرح کم ہونے کی بدولت عالمی طاقتوں نے افغانوں کو خوب استعمال کیا ہے۔پراکسی وار روایتی جنگ اور غیر روایتی جنگ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔پراکسی وار میں اصل لڑنے والا نظر نہیں آتا ہے۔مختلف گروپوں، قبیلوں، فرقوں اور قوموں کے جذبات کے ساتھ کھلواڑ کرکے

انہیں متشدد بنا کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔افغانستان کی سرزمین بھی پراکسی وار کے لیے خوب استعمال کی گئی ہے۔ یہ عام خیال کیا جاتا ہے کہ اس وقت اکثر غیر ریاستی عسکری گروہوں کی پشت پناہی پر کوئی نہ کوئی ریاست یا اس کا کوئی ادارہ لازمی طور پر موجود ہے۔امریکہ ،یورپ اور ان کے اتحادی افغان طالبان کو دہشت گرد سمجھتے ہیں۔وہ ان کے خلاف طاقت کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ان کی قیادت کو ڈرون حملوں کے ذریعے ہلاک بھی کرتے ہیں۔مگر انہیں قطر میں اپنا دفتر قائم کرنے کی بھی اجازت ہے۔اب وہ سفارت کاری بھی کرنے لگے ہیں۔

چین اپنی تجارت کا حجم بڑھانے اور یورپی منڈیوں تک سستی رسائی حاصل کرنے کے لیے اقتصادی راہداری منصوبہ جلد از جلد مکمل کرنا چاہتا ہے۔اس منصوبے کے مخالفین خطے میں بدامنی پھیلا کر اس منصوبے کو متاثر کرنا چاہتے ہیں۔چین جو ہمیشہ عدم تشدد کا قائل رہا ہے اب اسے بھی پراکسی وار کا حصہ بننا پڑ رہا ہے۔اپنے مقاصد کے حصول کے لیے طالبان سے رابطے قائم کرنا اس کی مجبوری بن گیا ہے۔دنیا اس بات کو تسلیم نہیں کرتی ہے مگر یہ امر اب طے ہے کہ اس خطے میں امن کی ضمانت طالبان ہی دے سکتے ہیں۔وہ جس ریاستی اتحاد کے ساتھ ہوں گے اس کے ہی مفادات محفوظ ہوں گے۔جن ریاستوں نے پراکسی وار کے لیے غیر ریاستی عناصر کو تقویت بخشی تھی یہ عناصر اب ان کے لیے بھی مشکلات کا سبب بن رہے

ہیں۔فرانس اور جرمنی میں پھیلتے ہوئے دہشت گردی کے سائے بہت سے سوالوں کا
جواب دے رہے ہیں۔

وکالت ایک مشن یا پیشہ

کسی بھی معاشرے کی ترقی اور خوشحالی میں انصاف کو بنیادی حثیت حاصل ہے۔ انصاف کے بغیر معاشرہ کبھی پر امن نہیں رہ سکتا ہے۔ ملک کے اندر نظام حکومت کوئی بھی ہو اگر انصاف نہیں ہوگا تو وہ نظام بد ترین ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر جمہوریت جیسے مقبول ترین نظام حکومت میں بھی انصاف نہ ہو تو وہ آمریت سے بھی بد تر ہو گا گویا جس معاشرے میں انصاف ہو گا وہی معاشرہ مثالی ہو گا چہ جاے کہ وہاں طرز حکومت کوئی بھی ہو۔آج دینا بھر میں سستے اور تیز تر انصاف کی فراہمی پر زور دیا جاتا ہے ترقی یافتہ ممالک اسی وجہ سے ترقی یافتہ ہیں کہ وہاں انصاف کا حصول انتہائی آسان ہے اور عام آدمی کو بھی انصاف میسر ہے تیسری دنیاکے ممالک کی پسماندگی کی وجہ انصاف کی عدم فراہمی ہے۔ جن معاشروں میں انصاف نہیں ہوتا وہاں ہمیشہ ظلم پروان چڑھتا ہے اور وہ معاشرے بدامنی کا شکار ہوتے ہیں۔ انسان نے انصاف کے حصول کے لیے مختلف طریقے اپنائے انسانی معاشروں میں عدالتوں کے نظام کو متعارف کروایا گیاقدیم تاریخ میں عام آدمی انصاف کے حصول کے لیے حکمرانوں کے دروازوں پر دستک دیا کرتے تھے یا ان کے مقرر کردہ ججوں سے انصاف کی بھیگ مانگا کرتے تھے اس عمل میں عام آدمی کو کافی مشکلات پیش آتی تھی وہ اپنا نقطہ نظر پیش کرنے سے ہچکچاتے تھے اسی وجہ سے انگلستان

میں طبقہ امراء میں سے چند افراد نے ان عام آدمیوں کی مدد کا فیصلہ کیا وہ لوگوں کے مسائل کو بادشاہ تک پہنچاتے اور ان کے لیے مرعات اور سہولتیں حاصل کرتے یوں آہستہ آہستہ لوگوں کا انصاف ملنا شروع ہو گیا اور وکالت کا شعبہ متعارف ہونے لگا انگریز جب برصغیر میں آیا تو اس نے عوام اور حکمرانوں میں فاصلہ کم کرنے کے لیے وکالت کا شعبہ متعارف کروایا یہاں بھی ابتداء میں امراء کا طبقہ اس شعبے سے منسلک تھا ان وکلاء کا کام عام آدمی کی آواز کو حکام بالا تک پہنچانا اور انہیں انصاف دلانا تھا یہ سارا کام بغیر کسی معاوضے اور لالچ کے سرانجام دیا جاتا تھا اور صرف خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر ہی وکلاء لوگوں کے کام آیا کرتے تھے۔ یہ انتہائی معزز کام تھا وکیل معاوضہ طلب نہیں کرتا تھا البتہ اگر کوئی اپنی خوشی سے کچھ دینا چاہے تو وہ وکیل کے پہنے ہوئے گاؤن کی پشت پر لگی جیب میں ڈال سکتا تھا وکیل کو اس سے کوئی غرض نہ ہوتی کہ اسے کیا دیا جا رہا ہے اسی دوران برصغیر کے مسلمانوں کو قائد اعظم جیسا عظیم وکیل ملا جس نے ان کے الگ ملک کے حصول کے لیے مفت مقدمہ لڑا آپ انتہائی نیک، دیانت دار اور شریف انسان تھے قیام پاکستان کے بعد بھی اچھے لوگ اس شعبے سے منسلک رہے اور وکالت کو عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا دنیا بھر میں ڈاکٹرز سمیت تمام شعبوں سے زیادہ باعزت اور باوقار شعبہ وکالت کا ہی ہے یہی مقام اسے پاکستان میں بھی حاصل رہا ہے پاکستان میں وکالت اور بار کونسلوں کے لیے پہلی بار legal practioners and

انیس سو چوہتر میں متعارف کروایا گیا اس ایکٹ کے تحت کوئی bar councils act
بھی وکیل فیس طے نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی پیسوں کی وجہ سے مقدمہ لینے سے انکار کر
سکتا ہے اس ایکٹ کے مطابق وکیل کے جو اوصاف بیان کیے گے ہیں اگر انہیں مذہبی انداز
میں دیکھا جائے تو وہ کسی متقی کے ہی اوصاف ہو سکتے ہیں یعنی وکیل کے لیے انتہائی اعلیٰ
کردار کا ہونا ضروری ہے بار کونسلیں بھی اعلیٰ روایات اور اچھے کردار کی حامل رہی
ہیں ان میں سے ایک روایت یہ بھی تھی کی بار کونسل کا صدر کبھی ہائی کورٹ کا جج نہیں
بنتا تھا مگر اب صورت حال یکسر بدل چکی ہے اب تو صدر بنا ہی اسی لیے جاتا ہے کہ جج
بنا جاسکے وکیل بار کونسلوں کے عہدے حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتے ہیں
صرف لاہور بار کے سیکرٹری کے الیکشن کا خرچہ نصف کروڑ سے زائد ہے اب اگر کوئی
شخص وکیل کے خلاف بار میں درخواست لے کر جائے تو اسے دھکے مار کر وہاں سے
نکال دیا جاتا ہے کیونکہ انہیں اپنے ووٹ عزیز ہوتے ہیں نہ کہ انصاف۔ وکیل کے ذاتی
مقدمے میں دوسری طرف سے کوئی وکیل نہیں پیش ہوتا ہے عام آدمی آج انصاف
دلانے والوں کے ہاتھوں ہی ذلیل و خوار ہو رہا ہے موجودہ دور میں وکلاء کا طرز عمل
اس شعبے کی روایات اور اعلیٰ اقدار کے بالکل منافی ہے اور وہ گھٹیا پن کا مظاہرہ کر رہے
ہے کبھی پولیس والوں کو تھپڑ مارے جا رہے ہیں کبھی ججوں کو جوتوں کی سلامی دی جا
رہی ہے کبھی عدالتی عملے کے بال نوچے جا رہے ہیں اور کبھی سرکاری اہلکاروں کے کپڑے
پھاڑے جا رہے ہیں مرضی کے فیصلے نہ

ہونے پر ججوں کو کمروں میں قید کر دیا جاتا ہے جج انہی وکلاء کے خلاف آئے روز سراپا احتجاج ہوتے ہیں سڑکوں بازاروں اور ہوٹلوں میں لوگ ان کی درندگی اور دہشت سے ڈرنے لگے ہیں آج پاکستان میں تمام شعبے تنزلی اور انحطاط کا شکار ہیں رشوت ہر جگہ عام ہے مگر وکالت کی اعلیٰ روایات اس بات کی ہر گز اجازت نہیں دیتیں کہ یہ لوگ بھی اس گندے نظام کا حصہ بنیں انہوں نے تو قوم کو برے نظام سے اچھے نظام کی طرف لے کے جانا ہے جس طرح قائد اعظم نے غلامی سے آزادی کی طرف سفر طے کیا مگر افسوس آج قائد کی تصویر ہر بار کونسل اور وکیل کے دفتر میں لگی ہوئی ہے مگر ان کی روایات دیانت داری اور سب سے بڑھ کر شرافت کہیں بھی نظر نہیں آتی وکلاء کے آئے روز کے جھگڑے رشوت اور بدعنوانی کے پیسے کی وجہ سے ہو رہے ہیں یہ لوگ اپنا اپنا حصہ بڑھانے کے معاملے پر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتے ہیں عدالتی کمیشن میں نام درج کروانے کے لیے بھی پیسے دیے جاتے ہیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ڈیلر اور وکیل میں کوئی فرق نہیں رہا۔ کیا یہ سب وکیل کی شان کے مطابق ہے ؟ مختصر یہ کہ آج کے معاشرے میں وکیل اپنا مقام اور عزت کھو چکا ہے اگرچہ کہ وکلاء اپنے دفاع میں یہ ضرور کہتے ہیں کہ اس شعبے میں چند لوگوں کہ وجہ سے انہیں ندامت اور شرمندگی کا سامنا ہے درست مگر حالات کو درست کرنا بھی ان کی ذمہ داری ہے کیوں ایسے وکلاء کے لائسنس منسوخ نہیں کیے جاتے ہیں اور محض ووٹ کے حصول کے لیے اتنی شرمندگی مول لی جاتی ہے آج عام آدمی یہ سوال کرنے پر

مجبور ہے کہ وکیل اب مہذب اور شائستہ کیوں نہیں رہے ہیں ؟ کیا اب ان کا تعلق معزز اور شریف خاندانوں سے نہیں ہے ؟ کیا ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی فرق رہ گیا ہے ؟ انہی وکیلوں نے آگے چل کر جج بننا ہے یہ کیا انصاف کریں گے ؟ان سوالوں کا جواب تو وکلاء کو ہی دینا ہے مگر یہ بات درست ہے کہ وکالت کا شعبہ پیسہ کمانے کے لیے ہر گز نہیں تھا بلکہ ایک مشن کے طور پر لوگ اس طرف آتے تھے ان کا مقصد نیک اور نیت صاف ہوتی تھی مگر جب سے وکالت کو پیشہ سمجھا جانے لگا ہے اور اسے دولت کمانے کا ذریعہ گردانا جانے لگا ہے تب سے اس میں بیگاڑ پیدا ہوا ہے اور خرابیاں اور کوتاہیاں پیدا ہونا شروع ہوئی ہیں اگر اسے مشن ہی رہنے دیا جاتا تو وکلاء کی آج یوں رسوائی نہ ہوتی جب سے وکالت کو پیشہ بنایا گیا ان کی پہلے جیسی عزت نہیں رہی قائداعظم جیسے لوگوں نے وکالت کو مشن کے طور پر اختیار کیا تھا ایسے وکلاء کا مقام اور رتبہ اب بھی بلند ہے۔

پاکستانی معاشرہ اور غیر ریاستی عناصر

پاکستان میں آئے روز نت نئے مسائل اور جرائم جنم لیتے رہتے ہیں۔ان مسائل اور جرائم نے پاکستانیوں کے مزاج پر منفی اثر ڈالا ہے۔ قوم کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت متاثر ہوئی ہے۔لاہور سے اغوا ہونے والے بچوں سے متعلق خبروں نے والدین کو خوف میں مبتلا کر دیا ہے۔اب والدین نے اپنے بچوں کو گھروں تک محدود کر دیا ہے۔ان کے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی ہے۔اب وہ پارکوں اور کھیل کے میدانوں میں جانے سے قاصر ہیں۔اس عمل نے بچوں کے اذہان پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔اس سے قبل تعلیمی اداروں میں دہشت گرد حملوں نے نئی نسل کو خوف زدہ کر دیا تھا۔

ریاستی ادارے ان جرائم پر قابو پانے میں ناکام نظر آ رہے ہیں اور ریاست بظاہر ان غیر ریاستی عناصر کے سامنے بے بس نظر آ رہی ہے۔

یہ امر باعثِ تشویش ہے کہ نئی نسل کو خوف میں مبتلا کیا جا رہا ہے۔اگرچہ کہ اس نسل کے پاس تعلیم اور معلومات حاصل کرنے کے ذرائع زیادہ ہیں مگر گزشتہ نسل کے مقابلے میں ریاستی اور سماجی شعور بہت کم ہے۔ایک خاص حکمتِ عملی کے تحت نئی نسل کو شعوری طور پر مفلوج کیا جا رہا ہے۔ریاست پر سے ان کا اعتماد کم ہو رہا ہے۔جمہوری اقدار اور ریاست کے فرائض کو سمجھنے سے وہ غافل ہو رہے

ہیں۔ یہ امر طے شدہ ہے کہ جس قوم میں سماجی شعور کم ہو گا وہاں غیر ریاستی عناصر مضبوط اور پر اثر ہوں گے۔ اب ریاست کے مقابلے میں غیر ریاستی عناصر معاشرے پر زیادہ اثر انداز ہوں رہے ہیں۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ متشدد تنظیمیں اور گروپس ہی غیر ریاستی عنصر ہوتے ہیں مگر اس کے علاوہ بھی کئی اقسام کے غیر ریاستی عناصر معاشرے کی سوچ اور فکر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنی مصنوعات کی فروخت کے لیے لوگوں کے سماجی، ثقافتی رویوں کی پروا کیے بغیر انہیں اپنی طرف راغب کرتی ہیں۔ پر تعیش اشیاء کو بنیادی ضروریات زندگی میں شامل کر دیا گیا ہے۔ جاگیر دار اور سرمایہ دار مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں۔ زمین کی خرید و فروخت کرنے والے سرِ عام رشوت دینے کا اعتراف کرتے ہیں مگر ریاستی ادارے اور قوانین ان کے سامنے بے بس ہیں۔ وہ سیاستدان یا حکومتی عناصر جو خود کو ماورائے قانون سمجھتے ہیں بھی انہی عناصر کا ایک حصہ ہیں۔ سپیکر قومی اسمبلی ایاز صادق بچوں کے اغوا کے معاملے کو معمول کا عمل سمجھتے ہیں۔ سماجی رابطوں کی ویب سائٹس پر لوگ مختلف موضوعات پر بحث کرتے ہیں۔ مسائل پر ہر طرح کی رائے عامہ سامنے آتی ہے۔ مگر اس فورم پر بھی سائبر کرائم بل کی صورت میں قدغن لگا دی گئی۔ رضا ربانی جیسے دانشور سے لے کر عمران خان جیسے سوشل میڈیا کا سہارا لینے والے لیڈر تک سب نے اس بل کی حمایت کی ہے۔ مکالمہ کی روایت کو ختم کیا جا رہا ہے۔ غیر ریاستی عناصر حکومتی عناصر کو گائیڈ لائن دینے لگے ہیں۔

کسی بھی ریاست کو اس کے عوام طاقت ور بناتے ہیں۔ مگر پاکستان میں عوام کو سیاسی طور پر مفلوج اور سماجی طور پر بے عمل کیا جا رہا ہے۔ پاکستان ایک فلاحی ریاست قائم کرنے کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ یہ خواب اب تک پورا تو نہ ہو سکا مگر یہ ملک ایک سیکورٹی اسٹیٹ ضرور بن گیا ہے۔ کوئی ریاست صرف اسی وقت فلاحی بن سکتی ہے جب وہاں احتساب کا موثر نظام موجود ہو بد قسمتی سے پاکستان میں اب تک احتساب کا نظام قائم ہی نہیں ہو سکا ہے۔ درحقیقت جن لوگوں کو احتساب کے لیے مقرر کیا جاتا ہے وہی احتساب کے لائق ہوتے ہیں۔ دوسری طرف کوئی بھی حکوت اپنا احتساب کرنا گناہِ کبیرہ تصور کرتی ہے۔ احتساب نہ ہونے کی صورت میں ملک میں دولت کی مساویانہ تقسیم کا کوئی نظام قائم نہیں کیا جا سکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ گئی ہے۔ وہی ہاتھ اس ملک کی تقدیر سے کھیلنے لگے ہیں۔ عام آدمی عدم تحفظ کا شکار ہے۔ اپنے مستقبل سے ناامید ہو کر وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے دولت کمانے کے چکروں میں پڑ گیا ہے۔ اسے صرف اپنی اور اپنی اولاد کی ہی فکر لاحق ہوتی ہے۔ اس روش نے اجتماعی سوچ اور شعور کو ناپید کر دیا ہے۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک کا پڑھا لکھا طبقہ اپنا کردار ادا کرے۔ رائیٹ اور لیفٹ کی بحث اب قصہ ماضی ہے۔ قوم کو غیر ریاستی عناصر کے چنگل سے آزاد

کروانا ہے۔ یہ عناصر درحقیقت سرمایہ درانہ نظام کی ہی پیداوار ہیں اس نظام کے منفی اثرات سے ملک اور قوم کو بچانا ہے۔ قوم کی شعوری تربیت ہی ریاست کو مضبوط بنا سکتی ہے اور مضبوط ریاست ہی اپنے عوام کے مفادات کا تحفظ کر سکتی ہے۔

مقاصدِ آزادی

قوموں کی تاریخ میں آزادی کا دن بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔زندہ قومیں یہ دن عزم، ولولے اور جوش کے ساتھ مناتی ہیں۔ باوقار قومیں اس دن اپنے لیے نصب العین اور مقاصد کا تعین کرتی ہیں۔ منزل کے حصول کے لیے راہِ عمل متعین کی جاتی ہے اور ماضی کے تجربات اور اقدامات کا محاسبہ بھی کیا جاتا ہے۔

آزادی کا بنیادی مطلب یہ ہے کہ قوم کے افراد اپنے افکار، نظریات اور فلسفے کے مطابق اپنی زندگیاں گزار سکیں۔ قوموں کے افکار اور نظریات صدیوں کے سفر کے بعد متعین ہوتے ہیں۔یہی افکار ان کے تہذیبی ورثے کی بھی آئینہ داری کرتے ہیں۔آزادی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ افراد اپنے اس تہذیبی ورثے کی نہ صرف حفاظت کریں بلکہ اس کے ارتقاء میں معاون ہوں اور ان مزاہم قوتوں کا بھی قلع قمع کریں جو اس ورثے کو تباہ کرنے پر آمادہ ہوں۔آزادی بالعموم تاریخی، سماجی، معاشی اور تہذیبی عوامل کے تحفظ اور بقا کا نام ہوتی ہے۔

اگر ہم پاکستان کے قیام کے لیے چلائی جانے والی تحریک آزادی کا جائزہ لیں تو اس کے کئی ایک پہلو سامنے آتے ہیں۔اس تحریک آزادی کا بنیادی مقصد سمندر

پار سے آئے تجارتی سامراج (جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں آیا) سے چھٹکارا پانا تھا کیونکہ تجارتی سامراج تہذیبی اور تاریخی قدروں میں رخنہ انداز ہوتا ہے۔ برصغیر میں آنے والے بیرونی سامراج نے ہمارا تاریخ اور تہذیب سے رشتہ منقطع کر دیا تھا اور یوں تاریخی ارتقاء اور تسلسل میں بسنے والا معاشرہ یکدم گھاٹی میں جا گرا اور وہ اس معاشرے میں منتشر اذہان کی پیدائش کا سبب بنا۔ بیرونی سامراج کا مقصد ہمیں اپنی تاریخی روایت سے الگ کرنا اور ہماری آزادی کا پہلا مقصد خود کو اس روایت کے ساتھ جوڑنا تھا۔ قابض سامراج اور مقبوضہ قوم کی اخلاقی قدروں میں تفاوت پائی جاتی ہے۔ انگریز سامراج نے اپنی اخلاقی قدریں یہاں لاگو کرنے کی کوشش کی برصغیر کا سماج تجارتی اخلاقی قدروں کی نسبت زرعی اخلاقی قدروں کے قریب تھا۔ اس آزادی نے ہمیں یہ موقع دیا کہ ہم اپنی اخلاقی قدروں کا تسلسل قائم رکھ سکیں۔ آزادی کے مقاصد میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آزاد ہونے والی قوم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اپنے نظریہ حیات کے مطابق گزار سکے۔ نظریہ حیات قوموں کے منالحیث مجموعی تصور کا نام ہے جو قومیں صدیوں کے تسلسل میں بنا پاتی ہیں۔ نظریہ حیات ہی قیامِ پاکستان کی بنیادی وجہ بنا۔ تصورِ پاکستان دراصل ایک خاص نظریہ حیات سے جڑا ہوا ہے اور وہ نظریہ حیات اسلام کا نظریہ حیات ہے اور اسی نظریے سے پاکستان کی بنیادوں کو سینچا گیا ہے۔

آزادی حاصل کرنے سے اپنی آزادی کی حفاظت کرنا اور اسے برقرار رکھنا زیادہ مشکل اور اہم بھی ہوتا ہے۔ جو قومیں اپنے ماضی کا احتساب کرنا جانتی ہوں وہ اپنی آزادی کی حفاظت بھی خوب کر سکتی ہیں۔ جو قوم مڑ کر اپنی تاریخ کی طرف نہیں دیکھتی وہ اپنے مستقبل کے خواب بھی نہیں دیکھ سکتی۔ تاریخ کو کوڑے دان میں نہیں پھینکا جا سکتا۔ جب تک ماضی میں سرزد ہونے والے تحسامات کا ازالہ نہیں کیا جائے گا اس وقت تک عمارت میں موجود نقص دور نہیں ہوگا۔ احتساب اسی کا نام ہے۔ آزادی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم اپنے نصب العین اور مقاصد کا از سرِ نو تعین کریں۔ پاکستان میں آزادی کا دن منانے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ہم جہاں سامراج سے آزادی ملنے کی خوشی منائیں وہاں یہ بھی دیکھا جائے کہ ہم اپنی منزل سے کتنے دور ہیں اور راستے میں کٹھنائیاں کیا ہیں اور ان کا مقابلہ کیسے کرنا ہے۔

بالعموم پاکستانی حکومتیں دستیاب وسائل میں یہ کوشش کرتی رہی ہیں کہ حصولِ پاکستان میں مضمر نظریے کی حفاظت کی جائے اور پاکستان کو ایک فلاحی ریاست میں تبدیل کیا جاسکے۔ آج کے دن حکومت کے ساتھ ساتھ اب ہر فرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس نظریے کی حفاظت کے لیے اپنا کردار ادا کرے اور ملک میں موجود دہشت گردی کی لہر کو مٹانے اور انتہا پسندی کے اژدھے کو مارنے کے لیے میدانِ عمل میں نکلے۔ جب تک قوم کا ہر فرد اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں کرے

گا اس وقت تک ہماری آزادی پر آج بھی بیرونی سامراج کی تلوار لٹکتی رہے گی۔ ہماری آج کی جدوجہد سے ہی ہماری کل آنے والی نسل سکھ کا سانس لے پائے گی اور فلاحی ریاست کے قیام کی منزل قریب سے قریب تر ہوتی چلی جائے گی۔

سماجی شعور کی کمی

پاکستانی قوم لاتعداد مسائل کا شکار ہے۔ قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک اس قوم کے مسائل میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے کیونکہ ہر مسلہ کئی مسائل کو جنم دیتا ہے۔ مسائل کا ادراک نہ کرنا اور پھر ان کے حل کے لیے کوششیں نہ کرنا بھی مزید مسائل پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اس وقت دہشت گردی اس قوم کا سب سے بڑا مسلہ ہے۔ توانائی بحران، تعلیم و صحت کے مسائل، خوراک و رہائش کی سہولتوں کا فقدان، امن و امان کی مخدوش صورتِ حال، غیر ریاستی عناصر کی فتنہ انگیزیاں، بیرونی دنیا کا ملک کے اندر خلفشار پھیلانا، انصاف کی عدم فراہمی اور نااہل قیادت اس قوم کے بڑے مسائل میں شامل ہیں۔ ان وجوہات کو تلاش کرنا بھی ضروری ہے جن کی بدولت یہ مسائل پیدا ہوئے۔

میں برصغیر کی تقسیم ہوئی اور ایک نیا ملک پاکستان بنا۔ اس وقت ہر چیز کا بٹوارا 1947 ہوا۔ علاقہ، صنعتیں، فوجی ساز و سامان، خزانہ، مال اسباب اور لوگ جو یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں آئے۔ لیکن ایک چیز جو تقسیم نہ ہو سکی وہ تاریخ ہے۔ آپ تاریخ کو تقسیم نہیں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ تاریخ نام کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ اس کا تعلق تہذیب و تمدن سے بھی ہوتا ہے۔ تقسیم کے وقت ایک ہی نیا ملک

بنا اور وہ پاکستان تھا۔ بھارت صدیوں سے موجود تھا لہٰذا تاریخ اور تاریخی ورثہ اس کے ہی حصہ میں آیا۔ بھارت کی تاریخ حملہ آوروں کی تاریخ ہے۔ وہ ان ہی حملہ آوروں کی تاریخ کے ساتھ جڑا رہا ہے۔ ہم بھی اسے اپنی ہی تاریخ سمجھتے رہے اور اب تک خود کو اسی تاریخ کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے قوموں کی شناخت جغرافیائی ہوا کرتی ہے اور ہر جغرافیہ کی اپنی تہذیب ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی تہذیب کو نہ پڑھا ہے اور نہ ہی اس سے کچھ حاصل کیا ہے۔ ہڑپہ، موہنجوداڑو اور سندھی تہذیب کے اعتبار سے یہ الگ خطہ رہا ہے۔ ہم نے کبھی بھی ان تہذیبوں کے ساتھ خود کو منسلک نہیں کیا ہے۔ جب ہم اپنی تہذیب اور تاریخ کے ساتھ متمسک نہیں رہے تو ہماری اپنی سوچ اور فکر پیدا ہی نہ ہو سکی اور نہ ہی بطورِ پاکستانی قوم ہمارا اپنا کوئی نظریہ پروان چڑھ سکا اور نہ ہی سماجی شعور میں پختگی نظر آئی۔ سماجی شعور میں کمی نے قوم کو مختلف حصوں میں بانٹ دیا اور کئی سوچوں کو پروان چڑھایا۔ قوم میں فکری اور نظریاتی تقسیم نے مسائل کو جنم دیا۔ سماجی شعور میں کمی کی بدولت جب قوم مختلف افکار میں تقسیم ہوئی تو اس کے حق و باطل کے معیار میں بھی تضاد آ گیا۔ قوم کا ایک طبقہ جسے اچھائی سمجھنے لگا دوسرے کے نزدیک وہی چیز بری قرار دی جانے لگی۔ اچھے اور برے طالبان کی بحث بھی سماجی شعور کی کمی کا نتیجہ ہے۔

اب تک پاکستانی ریاست یہ طے ہی نہیں کر پائی کہ اسے کیسا ہونا ہے۔ 11 اگست

کی قائداعظم کی تقریر نے پاکستانی ریاست کے خدوخال کو واضح کر دیا تھا۔ وہ 1947 اسے جدید فلاحی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ بدقسمتی سے شروع دن سے ہی پاکستانی مقتدرہ نے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے جمہوری افکار اور روایات کو پامال کیا ہے۔ انہوں نے اپنے مقاصد کے لیے مذہبی افکار کا غلط استعمال کیا۔ قوم کو مذہب کے نام پر تقسیم کیا۔ فرقہ واریت کو ہوا دی۔ جب اندر کے لوگوں نے یہ کام کیا تو باہر کا دشمن بھی سرگرم ہوا۔ اس نے بھی اپنے مقاصد کے لیے اسی طرح کے عوامل کو ہوا دی۔ کی افغان جنگ نے پاکستانی قوم کے اجتماعی شعور کو بھی بہت نقصان پہنچایا۔ ملک 1979 میں اسلام کے نفاذ کا نعرہ بلند کیا گیا ساتھ ہی فرقہ واریت کو بھی ہوا دی گئی۔ قوم کو تقسیم کرنے اور آمریت کو مضبوط کرنے کے لیے یہ سب منظم انداز میں کیا گیا۔ مذہب اور جمہوریت کو مقابل لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ اپنی تاریخ اور تہذیب کو غلط انداز میں کہیں اور جوڑنے کی کوشش کی گئی۔ ریاستی اداروں میں سوچ کی تقسیم اب بھی موجود ہے۔ ایک طرف مولانا طارق جمیل کے خطابات پر مخصوص مقامات پر پابندی لگائی جاتی ہے اور دوسری طرف دفاعِ پاکستان کونسل میں شامل تمام جماعتوں کو جلسے جلوس منعقد کرنے کی کھلی اجازت دی جاتی ہے۔ ریاست ضربِ عضب میں اپنی تمام تر توانیاں اور وسائل بھی صرف کرتی ہے اور حقانی نیٹ ورک کا دفاع بھی کرتی ہے۔

بطورِ قوم ہمیں اپنے اندر سماجی شعور پیدا کرنا ہوگا اور ایک منظم سوچ پر اکٹھا ہونا ہوگا۔جب قوم کی سوچ اور فکر ایک ہو گی تب ریاست بھی ایک جانب سفر کر پائے گی اور اس کے ادارے بھی اس قوم کی سوچ کے مطابق پالیسیاں بنا پائیں گے۔ہم اپنے مسائل پر اسی ذریعے سے قابو پا سکتے ہیں۔

قومی خود مختاری اور بیرونی اشارے

14 اگست 1947 کو پاکستان ایک آزاد اور خود مختار ملک کے طور پر معرضِ وجود میں آیا تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے یہ ملک اس لیے حاصل کیا تھا کہ وہ یہاں عزت اور وقار کے ساتھ اپنی زندگیاں بسر کریں گے۔ تحریکِ پاکستان کے قائدین نے مسلمانوں کو یہ باور کروایا تھا کہ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد وہ اپنی مرضی سے اس ملک میں رہ سکیں گے۔ نئی بننے والی پاکستانی قوم اپنی خارجہ و داخلہ پالیسی اپنی خواہشات کے مطابق ترتیب دے گی۔ یہاں کا آئین اور قانون مقامی تہذیبی ورثے کے عین مطابق ہو گا۔ ملک کے اندر کسی بھی قسم کی بیرونی عملداری اور مداخلت ناقابلِ قبول ہو گی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس بیانیے میں تبدیلی رونما ہوتی چلی گی اور پاکستان میں بیرونی مداخلت کا دائرہ کار وسیع ہوتا چلا گیا اور قومی خود مختاری کا مفہوم بدلتا چلا گیا۔ جو کام دشمن نہ کر سکتا تھا وہ دوستوں نے خوب کیا۔ دوستی کے نام پر دوست ملکوں نے یہاں اپنی مرضی کی بساط بچھائی اور من پسند چالیں چلی۔ سمندر پار اور ارد گرد کے ممالک نے یہاں خوب کھیل تماشا کیا اور بے دردی سے اس زمین کے مادی اور افرادی وسائل کو بھی لوٹا۔ 1979 میں

جب روس افغانستان میں داخل ہوا تو امریکہ ہمارا دوست بن کر یہاں آیا۔اس نے روس کی پیش قدمی روکنے کے لیے پاکستانی سرزمین اور افرادی قوت کا بھرپور استعمال کیا۔امریکہ نے یہاں کے پالیسی ساز اداروں پر اپنا اثر رسوخ قائم کیا۔ مسلم ممالک کے ساتھ ملکر یہاں ایک مخصوص سوچ کو بھی پروان چڑھایا۔جب سعودی عرب کی مخصوص سوچ نے یہاں پھلنا پھولنا شروع کیا تو ایران نے بھی یہاں کی شیعہ آبادی میں اپنا اثر قائم کیا۔ان دوست ملکوں کے تانوں بانوں نے یہاں فرقہ واریت کو فروغ دیا اور پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد اپنی زندگیوں سے محروم ہوئی۔11/9 کے بعد امریکہ ایک بار پھر ہمارا دوست بن کر یہاں آیا اور اس نے بغیر کسی حکومتی یا ریاستی اجازت کے اس سرزمین پر اپنے قدم خوب جمائے۔ریمنڈ ڈیوس کا قصہ تو محض ایک مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے وگرنہ یہاں پر امریکیوں نے کئی ایک پاکستانیوں کا بے دریغ خون کیا۔پاکستانی فوج کو ان مجاہدین کے خلاف لڑنا پڑا جن کو 80ء کی دہائی میں امریکہ نے دوست ممالک کے ساتھ مل کر روس کے خلاف لڑنے کے لیے تیار کیا تھا۔پاکستان میں اس وقت جاری ضربِ عضب اس کی ایک مثال ہے۔

چین کی پاکستان سے دوستی سمندر سے گہری اور ہمالیہ سے بلند ہے۔اس ملک نے بھی پاکستان سے دوستی خوب نبھائی اور اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے اسے بھرپور استعمال کیا۔سی پیک کا شور نہ صرف ملک میں ہے بلکہ اب عالمی سیاست بھی

اس کے گرد گھوم رہی ہے۔ بیرونی دنیا اس منصوبے کے خلاف ہے وہ اس کو سبوتاژ کرنے کے لیے تمام تر حربے استعمال کر رہی ہے۔ ملک میں موجود دہشت گردی کے واقعات کو اسی سے جوڑا جاتا ہے۔ پاکستانی بطورِ قوم اس کی بھاری قیمت چکا رہے ہیں۔ چینی مال یورپ اور امریکہ کی منڈیوں تک تو پہنچے گا ہی مگر مقامی مارکیٹ میں بھی اس مال کی فراوانی ہو گی۔ پاکستانی مارکیٹوں میں چینی مال کی فراوانی مقامی صنعت کو شدید نقصان پہنچائے گی۔ پاکستان نے بغیر کسی تجارتی معاہدے کے اس منصوبے کی تکمیل کی اجازت دی ہے۔ ملک کبھی بھی ٹول ٹیکس کی آمدن سے نہیں چلا کرتے زرعی اور اقتصادی شعبوں میں ترقی ہی ملکوں کی ترقی ہوا کرتی ہے۔ پاکستان اب ان شعبوں میں چین کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہماری حکومتوں کا چاہیے تھا کہ وہ چین کے ساتھ مربوط معاہدے کرتے اور چین کو اس بات کا پابند بناتے کہ وہ یہاں کے مقامی سرمایہ کاروں کے ساتھ مل کر صنعتیں قائم کرے اور ان صنعتوں کے پیداواری مال کو بھی یورپ اور امریکہ کی منڈیوں تک پہنچائے۔

پاکستانی سیاست میں عالمی دوستوں کی مداخلت اب کسی سے بھی پوشیدہ نہیں رہی یہی دوست ہمارے حکمرانوں کو مختلف امتحانوں میں سرخرو کرتے چلے آ رہے ہیں۔ نواز شریف، آصف علی، جنرل مشرف اور اب پھر نواز شریف اور ان کی اولاد کو تحفظ دینے کے لیے بیرونی دوست سرگرم ہیں۔ پانامہ کیس میں قطری دوست کے خط

نے ایک بار پھر ہمارے داخلی معاملات میں اثر انداز ہونے کی کوشش کی ہے۔
پاکستانی قوم کو اب اس امر پر توجہ دینی ہو گی کہ آخر کب تک ہماری قومی خود مختاری یوں ہی پامال کی جاتی رہے گی اور ہماری سیاست بیرونی اشاروں پر ناچتی رہے گی؟